پلکوں میں آنسو

صدیقہ بیگم

الہ آباد
پبلشنگ ہاؤس

طبع اوّل ـــــــــــ اکتوبر ۱۹۴۸ء

قیمت تین روپے

سید محمد ہاشم نے سرسوتی پریس سے چھپوا کر الہ آباد پبلشنگ ہاؤس سے
شائع کیا

اُس زبان کے نام جو اپنے ہی دیار میں غریب الوطن

ہے ــــــــــــــــــــــــــــــــ

صدیقہ بیگم

ترتیب

پیش لفظ

اُردو ادب کیلئے اب نہ تو صدیقہ بیگم اجنبی ہیں اور نہ ان کے افسانے۔ صدیقہ بیگم کا شمار اردو کے مقبول ترین افسانہ نگاروں میں ہے — وہ افسانہ نگار خواتین کی صف میں تو وہ بہت ہی ممتاز حیثیت کی مالک ہیں۔ نظر میں وسعت، فکر میں پختگی، عام انسانی ہمدردی اور ذوق کی بلندی کی شان جو اُن کے افسانوں میں ملتی ہے۔ وہ ڈاکٹر رشید جہاں اور عصمت چغتائی کے علاوہ کسی اور خاتون کے افسانوں میں نہیں ملتی اور جہاں تک موضوع میں تنوع کا تعلق ہے۔ وہ کسی افسانہ نگار خاتون سے پیچھے نہیں ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ موضوع کے تنوع کے لحاظ سے دوسری تمام افسانہ نگار خواتین سے وہ آگے ہیں تو ہرگز غلط نہ ہوگا اُن کی ادبی زندگی بہت تھوڑی ہے۔ پھر بھی جو شہرت، مقبولیت اور وقعت اُنھوں نے

حاصل کرلی ہے۔ وہ لائق ستائش ہے اور قابل رشک بھی۔

صدیقہ بیگم اپنے خیالات اور تصورات کے لحاظ سے ترقی پسندوں میں ہیں۔ نئے لکھنے والوں میں بھی ان کا تعلق آخری ٹولی سے ہے۔ آخری ٹولی سے میری مراد اُن افسانہ نگاروں سے ہے جو ۱۹۴۷ء کے بعد اُبھرے ۔۔۔ یعنی اُن کی افسانہ نگاری کی عمر زیادہ نہیں۔ لیکن اُن کے افسانوں میں احساس، شعور اور فن کی پختگی کی کمی نہیں۔ معمولی سے معمولی واقعہ کو اپنے افسانوں کا موضوع بنا کر واقعہ کو اس صورت کے ساتھ بیان کرتی ہیں اور جو اثر پیدا کرنا چاہتی ہیں کامیابی کے ساتھ کر دیتی ہیں اور معمولی واقعات کو سلیقے کے ساتھ مرتب کرکے ایک خوشنما افسانہ مرتب کر دیتی ہیں۔ پھر بڑی سادگی کے ساتھ واقعہ کو بیان کرکے کسی حقیقت کی طرف ہلکا سا اشارہ کر جانا ان کا بہت بڑا کمال ہے۔

صدیقہ بیگم کی افسانہ نگاری کو دو دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے کچھ دنوں تک لکھتے لکھتے وہ خاموش ہو گئیں۔ اُن کے شروع دور کے افسانوں میں، عام افسانہ نگاروں کی طرح جذباتیت، رنگینی، پلاٹ اور شاعرانہ لطافت ہے۔ لیکن زندگی کی حقیقتیں بہت کم ہیں۔ زندگی رنگینیٔ بیان اور جذباتیت میں کھو کر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ اُن کے پہلے مجموعہ 'ہچکیاں' پر تبصرہ کرتے ہوئے اُن کے شروع دور کے افسانوں کے متعلق پروفیسر احتشام حسین نے اپنی ریڈیائی تقریر میں کہا تھا۔

"رنگینیٔ بیان ہے، لطافت ہے، زبان کا لوچ ہے، جذبات نگاری ہے،
لیکن کوئی حقیقت نہیں ہے"

شاید اُن کی خاموشی اُن کی افسانہ نگاری کے حق میں مفید ہوئی۔ اس وقفے میں انہیں سوچنے اور سمجھنے کا موقع ملا اور جب دوبارہ انہوں نے لکھنا شروع کیا۔ تو اُن کے

اُن کے خلوص کا بہاؤ تیز کردیا۔ اُن کے بیان کا زور بڑھادیا۔ اُن کے فن کو
زندگی سے ہم آغوش کردیا۔۔۔"

ایسی منزلیں ہر فن کار کی راہ میں آتی ہیں اور ہر فن کار کا فن رفتہ رفتہ ترقی کرتا ہے۔ بڑی مشق کے بعد قلب و دماغ میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور فن کار کا تصور اور اس کا فن واضح ہوتا ہے۔ اس لئے اگر صدیقہ بیگم کے شروع دور کے افسانوں میں زندگی کی تڑپ نظر نہیں آتی تو تعجب کی بات نہیں۔ پھر بھی اتنی بات ضرور ہے کہ انھوں نے اپنی افسانہ نگاری جہاں سے شروع کی وہاں سے پیچھے نہیں ہٹی۔ اُن کا ذہن ہمیشہ آگے کی طرف بڑھتا گیا۔ اور اب وہ ایک مخصوص فلسفۂ حیات کی قائل نظر آتی ہیں۔ اُن کی منزل متعین ہے۔ یہی سبب ہے کہ اُن کا ہر نیا افسانہ پہلے سے زیادہ اچھا اور زیادہ کامیاب نظر آتا ہے۔ اور یہ کسی بھی مصنف کے لئے بہت بڑی کام یابی ہے۔

[illegible] کی اشاعت کو کئی برس گزر گئے۔ اس مدت میں دنیا نے بہت سی کروٹیں لیں۔ دوسری جنگ عظیم ہوئی اور فاشیت کی شکست پر ختم ہوئی۔ ہندستان آزاد ہوگیا۔ لیکن سامراجی چالوں کی وجہ سے ہندستانیوں کو وہ آزادی نہیں ملی جس کا خواب انھوں نے دیکھا تھا۔ چلتے چلتے انگریزی سامراج نے ملک کے ٹکڑے کردیئے تاکہ متحد اور آزاد ہندستان کے منصوبوں کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکے۔ ہند اور پاکستان کی تقسیم کچھ اس طرح ہوئی اور ملک کی اندرونی رجعت پسند طاقتوں نے سامراج کے مقاصد میں کچھ اس طرح ساتھ دیا کہ تقسیم کے ساتھ ہی سارے ملک میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا اور لاکھوں بے گناہ زندگیاں ہنگاموں کی نذر ہوگئیں۔ چند سیاسی بازی گروں نے سامراج کے اشاروں پر وہ سب کچھ کیا اور اپنے ہاتھوں ملک کا ستیاناس کرایا جو سامراج اب صدیوں میں نہ کرسکتا تھا۔

صدیوں کی پروردہ تہذیب برباد ہوگئی اور اب بھی ملک کے دونوں حصے عجب کش مکش
میں مبتلا ہیں۔ صدیقہ بیگم کے تازہ افسانوں میں جنگ سے اب تک کی بہت سی کامیاب
تصویریں ہمیں ملتی ہیں ـــــ اور ہمیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ موجودہ انتشار اور پراگندگی
کی تصویر کشی کرکے ہر شریف دل رکھنے والے انسان کی ترجمانی کر رہی ہیں ـــــ وقت
کے لحاظ سے موضوع پر افسانے لکھنے والوں میں کرشن چندر کے بعد صدیقہ بیگم کا ہی نام آتا
ہے۔ بہت سے مواقع پر جب ہمارے دوسرے فن کار خاموش رہے ہیں تو کرشن چندر نے
اُن کی رہنمائی کی ہے اور وقت کی ضرورت پوری کی ہے۔ اپنی پوری قوت اور صلاحیت
کے ساتھ اس لحاظ سے صدیقہ بیگم کی خدمات بھی نہیں بھلائی جا سکیں۔ انھوں نے بھی
ہمیشہ وقت کی آواز پر لبیک کہا ہے۔ اور جب بھی لکھا ہے تو پورے جوش کے ساتھ۔

اب صدیقہ بیگم کے افسانوں میں ہمیں زندگی کے متعلق ایک واضح تصور کی طرف
صاف اشارے ملتے ہیں۔ گرچہ یہ اشارے بہت لطیف ہوتے ہیں۔ تشبیہوں اور استعاروں
میں۔ لیکن ہمیں یہ سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی کہ زندگی کے متعلق ان کا نقطۂ نظر اشتراکی ہے
وہ سارے انتشار اور کش مکش کا واحد علاج اشتراکی نظام کے قیام کو سمجھتی ہیں اور یہ درست
بھی ہے۔ ہماری سماجی زندگی میں جس قسم کے مہلک اور غیر متوازن حالات پیدا ہوگئے
ہیں انھیں ختم کرنے کے لئے اشتراکی نظام کے قیام کے علاوہ کوئی دوسری صورت ہی نہیں۔
لیکن اشتراکیت کی تبلیغ کیلئے وہ اپنے افسانوں میں کھوکھلی نعرہ بازی سے کام نہیں لیتیں فن کو
پروپگنڈے پر قربان نہیں کرتیں۔ وہ افسانہ کی فنی نزاکتوں کا ہمیشہ لحاظ رکھتی ہیں ـــــ وہ
اب سماج میں اصلاح کی قائل نہیں۔ اُن کے خیال میں اس سماج کی بنیادیں لیکر پوری
عمارت اتنی کھوکھلی اور فرسودہ ہو چکی ہے کہ اُسے ڈھا کر از سرِ نو اشتراکی بنیادوں پر نئی تعمیر

کی ضرورت ہے۔

افسانوں کے موضوعات کے لحاظ سے صدیقہ بیگم کا دماغ بہت ہی زرخیز ہے۔ وہ کسی خاص موضوعات کی پابند نہیں۔ اُن کی نگاہ میں بڑی وسعت ہے اور مشاہدے کی کمی نہیں۔ وہ اپنے افسانوں کے لیے مواد تلاش کرنے کے لیے شہد کی مکھی کی طرح محنت کرتی ہیں —— کبھی کالج کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں۔ کبھی مزدوروں کی بستی میں، کبھی کسانوں کی جھونپڑیوں میں۔ کبھی ریلوے سٹیشن کی بھیڑ بھاڑ میں۔ کبھی ریل کے ڈبوں میں۔ کبھی اشتراکی نوجوانوں کی ٹولیوں میں۔ کبھی بنگال کے قحط زدہ علاقوں میں۔ کبھی دہلی کے فساد زدہ محلوں میں۔ کبھی متوسط طبقے کی گھٹی ہوئی جوان لڑکیوں میں —— وہ ہر جگہ سیر کرتی نظر آتی ہیں اور ہر جگہ سے اپنے افسانوں کے لیے مواد حاصل کر لیتی ہیں اور اُن کا قلم کسی ماہر کی تصویر کشی کی طرح نہیں کرتا۔ اُن کی آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں اُن کی تصویر وہ بڑی کامیابی کے ساتھ کاغذ پر اُتار دیتی ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ کسی خاص موضوع پر تو وہ بہت اچھا لکھتی ہوں اور دوسرے موضوع پر لکھتے وقت اُن کا قلم بہکتا ہو۔

لیکن صدیقہ بیگم کا قلم متوسط گھرانوں کی چار دیواری کے اندر بند عورتوں، نوجوان لڑکیوں کی جب تصویر کشی کرتا ہے تو اپنی پوری جولانی دکھاتا ہے۔ متوسط گھرانوں کا گھٹا گھٹا ماحول۔ آمدنی کم اور ضرورت زیادہ۔ اُن کی اوپر چڑھنے کی خواہش۔ اُن کے چھوٹے اُن کی مجبوریاں۔ اُن کے توہمات۔ خاص خاص خیالات اور خاص کردار۔ گھروں میں پرورش پانے والی جوان لڑکیوں کی کیفیات۔ اُن کے جذبات۔ ایک طرف بڑی بوڑھیوں کی نگرانی۔ دوسری طرف کالج میں پڑھنے والے بھائیوں کے ساتھ آزاد خیالی کی آتی ہوئی لہر۔ خیالات میں بدلنے والے اثرات۔ جذبات میں کشمکش۔ بغاوت کا

نوجوان کیا سوچتے ہیں۔ ان دونوں میں کتنا بُعد ہوتا ہے۔ یہ بڈھے بوڑھے کس طرح ہر
بات پر پچاس سال پہلے کے زمانے کو یاد کرتے ہیں اور جوانوں کو طعنے دیتے ہیں۔ اور
اس وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ پچاس سال پہلے وہ بھی اسی طرح آزادی پسند تھے
اور یہی جتنے سن کر جوان اور پھر بوڑھے ہوئے۔ صدیقہ بیگم نے متوسط گھروالوں کے مختلف
افراد کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اور اُن کی بڑی کامیاب تصویریں کھینچی ہیں۔ لیکن اس
کا مطلب یہ نہیں کہ دوسرے موضوع پر لکھتے وقت اُن کے قلم میں کوئی رکاوٹ پیدا
ہوجاتی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ وہ جس موضوع پر بھی لکھتی ہیں۔ خوب سوچ سمجھ کر لکھتی
ہیں اور خوب لکھتی ہیں۔

صدیقہ بیگم کا آبائی وطن سیوہارہ ضلع بجنور ہے۔ وہ ۱۹۲۵ء میں لکھنؤ میں پیدا
ہوئیں اور ابتدائی دس سال وہیں گزرے۔ پھر وہ سیوہارہ چلی گئیں۔ کچھ دنوں بعد وہ
علی گڑھ چلی گئیں۔ جہاں اُن کی ملاقات ڈاکٹر رشید جہاں سے ہوئی اور وہیں سے انھیں
لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ وہ خود اعتراف کرتی ہیں "علی گڑھ میں رشیدہ آپا سے ملاقات
ہوئی۔ اُن سے بہت کچھ سیکھا۔" یہ جان لینے کے بعد یہ سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی
کہ اُن کی زبان اتنی لطیف اور روچ دار کیوں ہے؟ اُن کے خیالات اس قدر صاف
کیوں ہیں؟ یہ لکھنؤ کی ابتدائی زندگی اور ڈاکٹر رشیدہ جہاں کی صحبت کا اثر ہے۔

اُن کے افسانے پڑھنے کے بعد آسانی کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ صدیقہ بیگم کے سینے میں
ایک سچے فن کار کی مضطرب اور بے چین روح کام کرتی رہتی ہے۔

زیر نظر مجموعے میں اُن کی دس گیارہ کہانیاں شامل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کہانی
کسی نہ کسی مقبول رسالے میں شائع ہو کر خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ اور اُن چند

علاحدہ تبصرے کی کوئی ضرورت نہیں۔ البتہ ان کہانیوں کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ "ہچکیاں" سے اب وہ بہت آگے جا چکی ہیں۔ اس مجموعہ میں بھی اُن کے بہت ہی تازہ افسانے نہیں بلکہ اکثر کو لکھے ہوئے چار پانچ سال گزر چکے ہیں۔ اور ان چار پانچ برسوں میں صدیقہ بیگم بہت سی منزلیں طے کر چکی ہیں اور آج اُن کا دماغ اور فن جس سطح پر ہے اُسے یہ افسانے صحیح طور پر نہیں بتا سکتے۔

ادھر جو چند افسانے اُن کے شائع ہوئے ہیں اُن کو پڑھنے کے بعد اُن کے شعور اور فن کی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے ـــ معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ بھی انھوں نے لکھا ہے وہ بہت سوچ سمجھ کر لکھا ہے۔ چنانچہ اُن کے تازہ افسانوں میں بہت ہی باریک بینی اور نازک واقعات نگاری کی بڑی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ واقعات نگاری میں انھوں نے انھیں چیزوں کو لیا ہے جو افسانے کی تعمیر میں حُسن پیدا کرنے کا باعث بن سکتے ہیں غیر ضروری جزئیات سے احتراز کیا ہے۔ یعنی انھوں نے فن کا مقصد سمجھ کر اسے برتنا بھی جانتی ہیں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے۔ وہ محض تفریح طبع اور وقت گزارنے کے لئے نہیں۔ بلکہ اس لئے لکھا ہے کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ انھوں نے چاہا ہے کہ اُن کا فن نئے سماج کی نئی تشکیل میں معاون ہو ـــ لیکن اس کے باوجود انھوں نے فن پر کوئی ضرب نہیں آنے دی۔ چنانچہ اُن کے افسانوں میں کسی مصلح کی خشک تقریریں نہیں۔ سیاسی کارکنوں کی ہنگامی نعرہ بازی نہیں۔ کسی تحریک چلانے والے کی [illegible] پروپیگنڈا نہیں بلکہ اُن کے فن میں ایک مخلص اور سچے فن کار کی [illegible] غرق ہے ـــ
"پلکوں میں آنسو" کے افسانوں میں کہیں کہیں برساتی ندی کا تیز بہاؤ ملتا ہے لیکن صدیقہ بیگم کے تازہ ترین افسانوں میں یہ بہاؤ نہیں۔ اب اُن کے فن میں گہرے [illegible]

سکون پیدا ہو چلا ہے جس میں کبھی کبھی جوار بھاٹا کی کیفیتیں پیدا ہو کر اُن کے فن میں تازگی پیدا کر دیتی ہیں۔

صدیقہ بیگم مخلص، حساس اور ذی شعور فن کار ہیں اور بقول پروفیسر احتشام حسین "اگر کوئی شخص یہ دیکھنا چاہے کہ کس طرح ایک خاص واقعہ کسی فن کار کے ذہن میں مرتسم ہو سکتا ہے تو اسے صدیقہ بیگم کے افسانوں کا مطالعہ کرنا چاہیے —" لیکن اس کے ساتھ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ صدیقہ بیگم کا فن اب تک اپنے نقطۂ عروج پر نہیں پہنچا ہے۔ وہ بہ تدریج آگے کی طرف بڑھ رہا ہے اور بڑھتا جا رہا ہے۔ اور ہمیں آئندہ دیکھنا ہے کہ آخر اس مصنفہ کی آخری منزل کہاں ہوتی ہے۔

سہیل عظیم آبادی

۲۵ر اپریل ۴۸ء

پیش لفظ ہوئی ----

فوجی اسپیشل آ رہی اور چلی گئی سخت ننگی بل کھاتی ہوئی چمکیلی ناگن پہ
پٹریں جس پر گاڑی پھسلتی چلی جاتی تھی۔ وہ گاڑی کے آخری ڈبے پر نظریں جمائے تھی۔
اس کا جی چاہ رہا تھا — کاش وہ ان نگاہوں سے ان نکلتی ہوتی
ہوئی گاڑی کو تھام سکتی وہ پھر دوڑتی ہوئی ان "سفید چہرے والے"
حبشیوں سے کہتی ——

"حضور بخشیش — حضور بخشیش بخشیش"۔ وہ اتنا کھینچ کر کہتی کہ اس کا
پورا چہرہ چھپ جاتا۔ اس کی آنکھوں کی عاجزی پورے چہرے پر اپنا سایہ ڈال
دیتی۔ گاڑی جا چکی تھی۔ آخری ڈبہ چھوٹا ہوتے ہوتے ایک نقطے کے برابر
رہ گیا تھا۔ زندگی اپنی وسعتوں کے باوجود خود بھی تو ایک نقطے ہی کے برابر

ہے۔ یہ اور بات ہے کہ پھر وہ اس نقطے کے بل پر ایک دائرہ بناتی ہے۔ ایک نہ ختم ہونے والا دائرہ ــ جسکا کوئی سرا نہیں، کوئی انجام نہیں ــ بالکل لامتناہی ــــ
"اونھ ــ" شکنت کے منہ سے ایک بے معنی کراہ نکلی اور اسکی نگاہیں بل کی بل کھاتی چمکدار ناگن سے ہٹ کر مٹھی میں بھینچے ہوئے ڈبل روٹی کے ٹکڑے پر پڑیں۔ ساتھ ہی اُس نے اپنی بائیں چھاتی میں ایک کسک سی محسوس کی جیسے اس ڈبل روٹی کے حقیر سے ٹکڑے سے بڑی چوٹ ہی تو لگی۔ جیسے وہ روٹی کا ٹکڑا نہیں بندوق کی گولی تھا جس نے اسکی کومل چھاتی میں گہرا ناسور کر دیا تھا ــ کبھی نہ بھرنے والا ناسور۔ اور وہ لال لال بندر نما فوجی گویا اپنی اس کمینی حرکت پر ابھی تک قہقہہ لگا رہا تھا۔۔۔ــــــ ننگ دھڑنگ فوجی ــ جسکے شفاف سینے پر نیلے نیلے حروف کھدے ہوئے تھے جیسے دل کی سیاہی سمٹکر سینے پر اُبھر آئی ہو۔ شکنت کو غصہ آنے لگا۔ اگر وہ اس ٹکڑے کے بجائے پوری ڈبل روٹی اسکی چھاتی پر دے مارتا تو شاید اسکو اتنی تکلیف نہ ہوتی۔ لیکن ٹکڑے کی کسمساہٹ ریت کے مہین ذروں کے مانند اسکے جسم میں محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے آہستہ آہستہ اپنے سینے پر ہات پھیرا جیسے وہ اُس کسک کو مٹا رہی ہو۔ مگر چوٹ لگی ہو تب ہی تو کہیں احساس کو ہاتھوں سے رگڑ کر ختم کیا جا سکتا ہے۔ اتنا رگڑنے کے بعد بھی تو وہ کسک ویسی کی ویسی ہی رہی۔ ریل جا چکی تھی پر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ابھی ابھی وہ روٹی آکر اُس کے سینے پر زور سے لگی ہو۔ گاڑی کا ڈبہ جو نقطہ بنکر معدوم ہوگیا تھا اسکی نظروں میں پھر اُبھرا اور بڑھتے بڑھتے ایک سفید ڈبل روٹی کی شکل بن گیا۔ اسکے دماغ

اس میں نرملا کا کیا قصور۔ وہ مجبور ہے۔ آخر اتنی بڑی چھاتی کہیں آدھے دار گز دہ کپڑے کے بس کی ہے۔ اسکو محسوس ہوا جیسے غبارہ پھولتا جارہا ہے۔ کون اسکو پھولنے سے روک سکتا ہے۔ بچوں کا کھیل ہے کون منع کرے۔ تبرجو بھی تو غبارہ پھلاتا ہے اور اسوقت تک پیچھا نہیں چھوڑتا جبتک پورا نہ پھول جائے۔ ایسی بھی کیا ضد آخر کو ایک حد سے گزر جانے کے بعد پھٹ ہی تو جاتا ہے اور پھر دہی جھری دار جھولتی ہوئی ربر۔ جسے دیکھکر گھِن آنے لگتی ہے۔ پھر اُس نے محسوس کیا جیسے یہ پھولنے والی چیز ہی نہیں۔ اُسکا سر جھک گیا۔ اسکی چولی بہت مضبوط ہے اور اس نے گنجائش بھی تو رکھی ہے۔ پڑوسن بائی نے کاٹی ہے۔ وہ کہتی تھی کہ کپڑے میں ہمیشہ بڑھت کی گنجائش رکھنی چاہئے۔ اور اُس نے پھر سوچا۔ نرملا زری اتو ہے، ذرا بھی تو آگا پیچھا نہیں دیکھتی۔ شکنتلا نے اپنے جسم میں گرمی محسوس کی اور آہستہ آہستہ اُسکے قدم اسٹیشن کے مُرم پر اٹھنے لگے۔ مُرم کی چبھن اُسکے پیروں میں اسی طرح محسوس ہو رہی تھی جیسے ڈبل روٹی کے ٹکڑے کی چوٹ۔ نرم گسک جو ابھی تک معدوم نہیں ہوئی تھی۔ اسکی چولی میں ابھی بہت گنجائش ہے۔ ویسے بھی وہ نرملا سے کئی سال چھوٹی ہے۔ نرملا اٹھارہ سال کی کڑیل جوان اُسکے جسم میں خون کھول رہا تھا۔ پسینہ کی ایک بوند اسکی ناک پر آکر ٹھہر گئی ـــــ اور گرنے کا انتظار کرنے لگی۔ اس نے ہاتھ سے اسکو پونچھ دیا۔ پسینے کا وہ گرم گرم قطرہ اسکے سینے کی گرمی کا اظہار کر رہا تھا۔ اُسکے جی میں آیا کہ نرملا پر جھپٹ پڑے اور خوب تھپڑ رسید کرے۔

"کمینی ـــــ کوئی چار پیسے کی ڈبل روٹی کے لئے اسطرح ننگا ہوتا ہے۔"

اسکی نظروں کے سامنے وہی بھنچی ہوئی چوٹی جھول گئی اور پھر غبارہ جیسے ہوا
میں اڑنے لگا۔ اُس نے آنکھیں بھینچ لیں گویا اُسکے بھولنے کا بس یہی ایک
طریقہ تھا۔ کاش دماغ پر بھی اسی قسم کا کوئی ڈھکن ہوتا جو اس کے اپنے قبضہ
میں ہوتا جب چاہتی سوچنا بند کر دیتی۔ نرملا آنکھوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ گاڑی
جا چکی تھی، سگنل اُٹھ گیا تھا۔ بل کھاتی ہوئی چمکدار ناگن جیسی سیاہ پٹری کی شکل
میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اور آنکھیں بند کرتے ہی سب غائب ـــــ گردہ لال
لال گورا فوجی ـــــ چھاتی کی کسک ـــــ ڈبل روٹی کا ٹکڑا ـــــ نرملا کی بھنچی
ہوئی چوٹی ـــــ پھولا ہوا غبارہ ـــــ جو پکڑنے کا نام ہی نہ دیتا تھا ـــــ سب بیک
وقت اسکے دماغ میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ اسکو ڈبل روٹی اور چیل نہیں ملے گی
تو کیا مجھکو ملے گی جو ہر وقت ہی تو چولہے کے پاس رہتی ہوں۔ اسکی کھلی ہوئی
آنکھیں اور زیادہ پھٹ گئیں ـــــ اسکو اپنی غلطی کا احساس ہوا ـــــ بیوقوف
کہیں کی۔ آخر یہ غبارہ کبتک پھولا رہے گا ایک دن ربڑ گھس جائے گی۔ غبارہ
ـــــ ٹھائیں ـــــ پھر جھولتی ہوئی ربڑ ـــــ کوئی مڑ کر بھی تو نہ دیکھے گا یہی
وقت ہے ہنسی کا ـــــ اُس نے زور سے جھٹکا دیا اور ساڑی کا پلّو اُسکے سینے سے
اُچھل کر الگ جا پڑا۔ اب کیا ہوتا ہے ـــــ سانپ گزر گیا ـــــ اُس نے
پھر پلّو کو اُٹھا کر اسی طرح لپیٹ لیا۔

"دیدی ـــــ دیدی ـــــ" وہ چونک پڑی۔ اُس کے قدم رک گئے۔
لال لال گورا فوجی نظروں سے اوجھل ہو گیا ـــــ چھاتی کی کسک مٹ گئی۔ نرملا
کی بھنچی چوٹی اور وہ پھولا ہوا غبارہ سب ہوا ہو گیا تھا۔ اسکے ہاتھ میں

ڈبل روٹی کا ٹکڑا تھا اور سامنے سرجو۔

"تجھے بھی کچھ نہیں ملا ـــ ؟ سرجو نے بڑے تعجب سے پوچھا۔

"نہیں ـــ"

"ـــ نرملا کو تو آج پوری ڈبل روٹی ملی ـ مکھن بھی ـ اور ایک بڑا ڈبہ جیلی کا۔

"اسکو کیوں نہ ملتا ـــ"

"او ر دیدی! ایک گورے نے اسکے ایک مکا مارا"

"کہاں ؟ ـــ" شگفتہ نے چونک کر پوچھا۔

"کوئی غصہ سے تھوڑا ہی ـ بس یونہی ہنس کر۔ پھر دونوں ہنسنے لگے۔ گورے نے اپنی تھیلی سے جھٹ ڈبل روٹی ، مکھن اور ڈبہ اسکی گود میں ٹھونس دئے۔

شگفتہ نے اپنی بائیں چھاتی میں پھر وہی کسک محسوس کی۔ جیسے ڈبل روٹی کا ٹکڑا دوبارہ آکر اسکی ننھی چھاتی سے ٹکرایا ہو۔ گورے کی شکل اس کی آنکھوں میں پھر گئی جو اپنی اس حرکت پر کھل کھلا رہا تھا۔

چپ سرجو ـــ دونوں گھر کی طرف چل پڑے ہوئے ـــ خاموش۔ ان جواریوں کی مانند جنھوں نے اپنی تمام پونجی ہار دی ہو اور اب خالی ہات واپس جا رہے ہوں۔ نہ جانے کیا سوچتے ہوئے شگفتہ کو بار بار نرملا کا خیال بے چین کر رہا تھا۔ بے ایمان کھلاڑی یہ ایمانداری کا سودا نہیں مگر وہ بھی اس سے کب کم ہے۔ نرملا ایسی گوری بھی تو نہیں ـــ گیہواں رنگ ـــ اس سے ہزار گنا خوبصورت۔ نرملا تو اسکے پیروں برابر بھی نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ نرملا کی طرح ننگی نہیں۔ اسکو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ نرملا کے ساتھ ایک چھٹے

میدان میں دوڑ رہی ہے نرملا آگے بڑھ گئی اور وہ پیچھے پیچھے گویا گھسٹتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔

"اچھا — دیکھ لونگی اس نرملا کی بچی کو — کل بھی تو اسپیشل آئے گی۔ کوئی آج آخری گاڑی تھوڑا ہی آئی ہے —"

"دیدی — جب آج کچھ نہیں ملا تو کل کیسے ملیگا۔"

"ملیگا کیسے نہیں — میں دیکھونگی کیسے سارے کا سارا نرملا لے جاتی ہے۔" رہ رہ کر شکنت کو جیلی اور مکھن کا ذائقہ بے چین کر رہا تھا اور وہ دیر تک کل کی ان نئی چالوں پر غور کرتی ہوئی چلی جا رہی تھی — اسکے قدم کبھی تیز ہو جاتے اور کبھی خود بخود ہلکے — اسی طرح وہ گھر پہونچ گئی۔ اس نے آہستہ سے تار کھولا اور دونوں بہن بھائی خاموشی سے کٹیا میں داخل ہوگئے۔

اگلے روز اسپیشل کے آنے سے دو گھنٹہ پہلے سے شکنت کا سینہ جیسے اندر سے دھک دھک کر رہا تھا۔ اسکے ذہن میں ایک پورا ناٹک تھا — ایک ناٹک — جس نے کتنی بار اسکا ریہرسل اپنی تاریک کوٹھری میں کیا پھر بھی وہ اپنی اداکاری کو کہیں تک نہ پہونچ سکی۔ جب کوٹھری کے اندھیرے میں وہ اس ناٹک کو نہ کھیل سکی تو پھر کس طرح دن کے اجالے میں سب کے سامنے اداکاری کر سکے گی — پھر ہمت کرکے جلدی سے اس نے راجو کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور آہستہ آہستہ چلنے لگی — جتنی آہستہ وہ بڑھتی اس سے بہت آگے نکل گیا — شکنت کے دماغ میں ایک خوبصورت کا تصور سا تھا۔ وہ بار بار اپنے جسم کا جائزہ لے رہی تھی۔ آج پہننے کے بعد بھی وہ محسوس کر رہی تھی جیسے وہ

نگی چلی جا رہی ہے ـــــ راستہ چلنے والوں کو دیکھ کر وہ ٹھٹک جاتی ـــــ اور اب اسٹیشن کے ترم پر اُسکے قدم کچھ اس طرح پڑ رہے تھے جیسے وہ اُن سے بھی ڈر رہی ہے۔ نرملا کو دیکھ کر وہ ٹھٹکی ـــــ

"آ گئی ـــــ تا ـــــ چھنال" اُسکے دماغ میں گونجا۔ پھر جیسے وہ خود بخود جھینپ گئی۔ اُسکے دماغ میں نہ تو لال لال گورا تھا، نہ ڈبل روٹی کا ٹکڑا ـــــ نہ پیسے کی کسک اور نہ غبارہ ہی ـــــ

"دیکھونگی ـــــ آج نرملا کو کیسے ملتا ہے۔" پھر بھی نہ جانے کیوں اسکا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اور یہ مقابلہ سخت تھا۔ اس کے پاس دھرا ہی کیا تھا۔ اسکا جی چاہا کہ اسٹیشن سے بھاگ جائے اور اپنی اندھیری کٹیا میں جا کر دم لے۔ جس کے اندھیارے میں چاندنی کا سکون تھا پر جیسے کسی نے اس کے پاؤں میں کیلیں ٹھونک دی ہوں ساری کا پلّو اس کی گرفت سے چھوٹنا چاہتا تھا پھر بھی اس نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

"کمبخت پیچھے ہی پڑا ہے" اس کو غصّہ آنے لگا اگر گھر پر ہوتی تو اس کو پھاڑ کر بیر بیر کر دیتی مگر اس وقت گاڑی آنے والی ہے سگنل ہو چکا ہے پھر بھی اتنا تو وقت تھا کہ وہ بھاگ جاتی، اس کا دماغ بڑی تیزی سے دوڑ رہا تھا اور پھر جیسے زمین میں گڑے ہوں وہ نرملا کو دیکھ کر جاتے جاتے رک گئی۔

"کیوں نستکت بائی ـــــ بھگوان جانے آج کون آتا ہے کہیں وہ کلموہے حبشی نہ آ جائیں جو بھاگنا ہی پڑے۔

"نہیں ـــــ پر دیکھو کون آتا ہے؟" اُس نے مشکل سے جملہ پورا کیا

اور پھر نرملا کی طرف حریص نظروں سے دیکھنے لگی اس کے اعتماد کو ٹھیس لگی جیسے
نرملا اس سے زیادہ خوبصورت ہے ــــ نرملا کی بھیگی ہوئی چوٹی اسکو ہنسی آگئی۔
گھڑ گھڑ کی آواز کے ساتھ جیسے وہ فضا میں اڑتے اڑتے کسی گہرے کنڈ میں
جاگری ہو۔ گاڑی رینگتی ہوئی پلیٹ فارم پر آرہی تھی وہ غور سے دیکھنے لگی
گورا فوج ہے یا ہندستانی ــــ ٹرین کے رکتے ہی جیسے وہ سب کچھ بھول
گئی اس نے دماغ پر زور ڈالا ماتھے پر ہلکا سا پسینہ آگیا۔ ــــ نرملا
کو دیکھ کر اس کے جان میں جان آئی اس نے ساری کے پلو سے ماتھے کا پسینہ
پونچھا ــــ اور آہستہ سے کہا ــــ صاب واٹر ــــ [illegible] ــــ
وہ کام طلب کر رہی تھی حالانکہ وہاں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اس سے پانی دینے
کو کہتا

"آگے بڑھو" ــــ دیکھو نرملا کو صاب نے پانی کا ڈبہ دیدیا" وہ ٹیپ
سے پانی بھر رہی ہے۔ نرملا کو دیکھ کر وہ جل ہی تو گئی
اس کی نظریں ان دو ہندستانیوں پر ٹکیں جو بیکار کی بحث میں الجھے ہوئے تھے۔
"دیکھا آزادی کا اعلان ہوگیا" "انگریزوں کو بھاگنا ہی پڑا۔ اب ہندستان
آزاد سمجھو"

"ــــ بیکار باتیں ــــ آزادی، غلامی ــــ غلامی آزادی"
کتنی وہ ایسی بیکار باتیں سنکر کیا کرتی۔ اس نے دوسرے سپاہی کو دیکھ کر
اپنا آنچل ڈھلکا دیا اور پھر غور سے اپنے جسم کا جائزہ لیا ــــ وہ جھینپ گئی۔
کاش زمین پھٹ جاتی ــــ اس نے زور سے بھی زیادہ اپنی [illegible]

رکھا تھا۔ ویسے بھی چولی کتنی ڈھیلی تھی اور غبارہ جیسے پچک رہا ہو۔
"ہائے رام" دوڑو ـــــ دوڑو ـــــ مار ڈالا اسکا بھائی چلا رہا تھا، وہ اسکی طرف بے تحاشا دوڑی ایک گورا اسکو مار رہا تھا ـــــ شکنت نے اپنے آنچل کو جھٹکا دیا۔
"ہندستان آزاد ہوگیا ـــــ مگر یہ گورے فوجی ـــــ کیا اسی طرح غریب دکھیوں کو ستاتے رہیں گے۔"
بھائی کی محبت نے اس کو بھوکی شیرنی بنا دیا۔ پر وہ فوجی تھا، شکنت ڈر گئی وہ اسکا کچھ بگاڑ نہ سکتی تھی ـــــ غصہ سے اسکی آنکھیں سُرخ ہوگئیں جیسے کسی نے خون بھر دیا ہو۔ ساری کا پلّو اپنی جگہ پر آگیا ـــــ اُس نے ستر جو کو سینہ سے لگا لیا اور پلّو محبت کے بے پایاں جذبہ سے سنبھل نہ سکا وہ گر پڑا۔ شکنت بھول گئی کہ اسکی چولی پھٹی ہوئی ہے۔ گورے کی نیلی نیلی بھوکی آنکھیں شکنت کے اس کرب میں لذت لے رہی تھیں۔ ایک فوجی نے پوری ڈبل روٹی اس کی طرف پھینکی لیکن شکنت نے ناگن کی طرح بل کھاکر اس کو دور پھینکدیا یہ روٹی اسکو نہیں چاہئے۔ وہ ابھی زندہ ہے، اس کے جسم میں روح ہے ـــــ احساس خودداری ہے وہ ابھی مری نہیں اس تاجرانہ زندگی میں بھی محبت کا جذبہ فنا نہیں ہوا۔ بھوکے مرجائینگے پر ایسے کمینے کی روٹی ـــــ بل کھاتی ہوئی ناگن ابتک اپنے پلّو سے بے خبر تھی۔ اسکے جسم میں خون تیزی سے دوڑ رہا تھا اور وہ ہیجان ان تمام جذبوں پر حاوی تھا جس کو پُرانے فلسفی نفسانی احساسات سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ جذبات کی رو میں کچھ اس طرح بہتی چلی گئی کہ تھوڑی دیر

کے لئے ماحول کا احساس بھی ختم ہوگیا اور جب اُسکو یہ معلوم ہوا کہ اسپیشل جانے
والی ہے اس کی چوبیس گھنٹے کی اُمیدیں سرخ سرخ موم میں مل گئیں۔ اس کے
پیروں تلے جیسے زمین نکل گئی ہو۔ اگر آج بھی کچھ نہیں ملا تو پورا پہاڑ سا دن
نرملا کا خیال اس کے دماغ سے کوسوں دور نکل گیا تھا ـــــ ساری کے
پلّو پر اس کی نظریں جمیں اور پھر چولی پر جو داہنی طرف سے پھٹی ہوئی تھی غبارہ
جیسے فضا میں اُڑتے اُڑتے رک گیا ہو۔ کاش وہ پھوٹ جاتا۔ چھوٹا غبارہ کس
کام کا آنکھوں کو بھی تو سندر نہیں لگتا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ ایک چھوٹی
بچی ہی ہو جائے اور بازار سے غبارے لاکر ان کو خوب پھلائے ـــــ مگر ستر جو
جو بچہ ہونے کے باوجود غبارے سے نہیں کھیلتا ـــــ بیوقوف کہیں کا ـــــ
گرا ہوا پلّو سرکتے سرکتے زمین پر آرہا ہے سینے میں جیسے چیونٹیاں رینگنے لگیں دبے
سے گورے بڑے غور سے دیکھ رہے تھے اُن کی نظروں سے اُس کے جسم میں گدگدی
سی پیدا ہوئی جیسے گرم گرم بدن پر ٹھنڈے پانی کی بوندیں ـــــ یہ فوجی
جیسے کسی نے اسکے پاؤں گاڑ دئے ہوں، ہاتھ باندھ دیے ہوں ـــــ نرملا
کبھی کبھی اس کو نظر آجاتی۔ جس کے دونوں ہاتھ بسکٹوں اور جلیبی کے ڈبوں
سے بھرے ہوئے تھے آخر شکست ہی میں کوشش کی تھی ـــ انتقام کا جذبہ جیتا
ہوا دور نکل گیا ـــــ شکست ـــ کمبخت ہندوستانی عورت ـــ جو عصمت پوش
یہاں کھڑی ہے اپنے اندر کبھی انتقام کی قوت رکھ سکتی ہے جس نے بھوک کے
سائے میں جنم لیا ہو، غلامی کی گود میں پلی ہو، مذہب نے سکھایا ہو جو فرض کو خوشی سے
کھیلتی رہی ہو ـــ وہ کبھی انتقام لے سکتی ہے، ہمّت کسی نے سکھائی

ایک ٹکڑا ابھی نہیں دیا پردہ ابھی تک پلّو سرکائے کھڑی تھی ـــــ بھارت ماتا کی وہ بھولی بھالی تصویر ـــــ جو نہ جانے کیوں نا امیدیوں میں بھی آس کی کرنوں کو جھلملا دیکھتی ہے۔

گاڑی روانہ ہوگئی اور ہاری ہوئی اداکارہ پچھلے دن کی طرح اپنی منزل پر چل کھڑی ہوئی مستقبل کے سپنوں میں کھوئی ہوئی۔

"دیدی آج بھی کچھ نہیں ملا ـــــ تیری چولی بھی تو پھٹی ہوئی تھی"

نکہت کے قدم چلتے چلتے رک گئے وہ گھبرا گئی ماتھے پر پسینہ کے قطرے اُبھر آئے جیسے وہ راز افشا ہوگیا جو تاریکیوں کی نہ جانے کتنی تہوں میں دبایا گیا تھا ـــــ وہ گھبرا گئی جیسے اس نے کوئی خواب دیکھا اندھیاروں میں سپنے بھی دکھائی دیتے ہیں اور وہ بھی کتنے بھیانک ـــــ سرجو اپنی تمام طاقت سے غبارہ پھلا رہا تھا جو پھولتے پھولتے ایک بڑے فٹ بال کی برابر ہوگیا ـــ نکہت ڈر گئی کہیں پھوٹ نہ جائے ـــــ اور سرجو کا ہات اس غبارہ کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھا، کاش یہ بڑھ کر زملا کی طرح چولی کو سکا دے جواب بھی بہت ڈھیلی تھی ـــــ اور پھر ـــــ ڈبل روٹی کے ٹکڑے کی چوٹ ـــــ نرم کسک جو ابھی تک بدستور محسوس ہو رہی تھی جیسے دریا کے پانی پر کسی نے پتھر کا ٹکڑا مارا ہو، پانی کے ان گنت حلقے آپ ہی آپ بنتے اور بگڑتے رہے۔ پتھر کا ٹکڑا پانی کی گہرائی میں زمین کی تہ تک پہنچ کر معدوم ہوگیا پھر بھی اس کے حلقے دریا کے سینے پر لہریں لے لے کر اُبھر رہے تھے
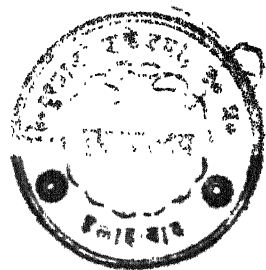
ثروت

بھائی جان کی شادی کیا ہوئی سارے گھر میں طوفان آگیا اور پھر ایک
چھوڑ دو دو جوان کڑیل لڑکیاں گھر کی نذر کردی گئیں۔ یوں تو ہر گھر میں شادی
ہوتی ہے دلھن آتی ہے مگر ہمارے بھائی جان کی شادی ہی نرالی ہوئی دلھن
آئی تو آئی مگر جہیز میں ایک عدد سالی بھی ساتھ لائی۔ ایک دلھن سے ہی
ہم ٹھیک سے تیار نہ ہوئے تھے اور پھر یہ سالی اللہ بچائے اس غیر متوقع تحفے
سے ——— ویسے ہی گھر میں لڑکیوں کی کون سی کمی تھی جو یہ ایک اور اضافہ
ہوا مجھے رہ رہ کر بھائی جان کی اس حرکت پر غصہ آرہا تھا بھلا یہ بھی کوئی
بات ہوئی ——— تم سے دلھن لانے کو کہا تھا اور آپ ایک سالی کا معاملہ
بھی طے کر آئے اور پھر جب اتنی بگڑیں تو ان کو کس طرح ڈھالا ہی نہیں

ہونے کی بات نہیں تم خود سوچو، بے ماں کی لڑکی، ثواب ہی ہوگا ـــــ خدا کا خوف کرنا چاہیے" بیچاری بے ماں کی بچی" بھائی جان کی زبان سے "بے ماں کی بچی" بار بار نکل رہا تھا اور ان کا بس چلتا تو اس فقرے کے ادا کرتے میں رو ہی تو دیتے ـــــ اور پھر خدا کا خوف اور ثواب ـــــ مجھے اس پر غصہ بھی آیا اور ہنسی بھی، روزے نماز سے دور کا واسطہ نہیں، چوبیس گھنٹے لامذہبیت پر لیکچر ـــــ اور ثواب کمانے کے لئے گویا ہمیں دنیا میں اکیلے رہ گئے ہیں۔

"آپا ـــــ" میں چونک پڑی دیکھا تو سالی صاحبہ کھڑی ہیں آنکھوں میں مردنی چھائی ہوئی جیسے روتے روتے آکر کھڑی ہو گئی ہیں، جھکی جھکی آنکھیں۔

"کیا ہے" میں نے انتہائی ضبط کرتے ہوئے کہا، اور سالی صاحبہ حسب معمول خاموش ـــــ ایسی خاموش لڑکی دور دور دیکھنے میں نہیں آسکتی ـــــ بھلا جوان لڑکی اور اتنی خاموش ـــــ وہی اداس نظریں جو ہردم زمین کو تکتی رہتی ہیں آسمان کی طرف دیکھنا تو شاید اُس نے کبھی جانا ہی نہ تھا اور اب بھلا اس کی کیا تُک کہ آئیں "آپا ـــــ" اور پھر آگے آیت ـــــ

میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ بھائی جان کی آواز سنائی دی "ثروت! بھئی ثروت کہاں گئی؟"

"وہ دیکھو تمہیں بھائی جان بلا رہے ہیں" اور ثروت نے آہستہ آہستہ قدم اُٹھائے گویا پھولوں پر چلنے کی مشق ہو رہی ہے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن آئے نہیں ہوئے اور چوبیس گھنٹے گھر میں ثروت ثروت کے نعرے لگتے ہیں اگر میں بولتی ہوتی تو خدا جانے کیا حال ہوتا ـــــ اور ان اُمی کو تو دیکھو

یہ عمر ہونے کو آئی اور اتنی عقل نہیں ـــــ پرائی لڑکی کو گھر میں رکھنے کے لئے
تیار ـــــ اور اپنی بیٹی جس کو اپنی کوکھ میں نو مہینے رکھا اس کا اتنا خیال نہیں
ـــــ آخر کوئی کب تک دیکھے ـــــ باہر جو میری نظر پڑی تو کیا دیکھتی ہوں
بھائی جان کیمرہ لئے کھڑے ہیں ثروت اسٹول پر بیٹھی ہیں میں نے بھیا ک
سے جو قدم اٹھایا تو پاؤں پائینچے میں الجھ گئے وہ تو خدا کا شکر ہے کہ بچ
ہی گئی ورنہ چاروں شانے چت پڑی ہوتی اور تصویر میں ایک اور تصویر ہو جاتی

"کیا ہو رہا ہے بھائی جان"

"کچھ نہیں" ـــــ جیسے میں دودھ پیتی بچی ہوں جو نہیں سمجھتی ـــــ

"بھائی جان ہماری تصویر نہ کھینچیے گا" میری زبان سے بے ساختہ نکلا
حالانکہ میں جانتی تھی اس وقت تو بھائی جان کے سامنے بات کھونی ہے
التجا کرکے۔

تمہاری تصویر پھر کھینچ دیں گے کل ایک فلم رہ گئی ہے۔ نیا رول لائیں گے
تو ایک نہیں دو تصویریں کھنچوا لینا" جیسے آگ لگ رہی ہو دل میں جل رہی ہوں
میری تصویریں اتنی بلند نہ ہوتیں تو شاید میں ایک آدھ تصویر کھنچوا ہی لیتی
اور اب جیسے سارا کمرہ [illegible] دیکھوں، بڑی بڑی آنکھیں، [illegible] بھنویں
دوسرے بھرپور ہے میری نظر ثروت پر جم کر رہ گئی ـــــ یہ بھی کوئی صورت ہے
گورا جسم جیسے گندھا ہوا ہو۔

"آپ ثروت آپا کے پاس کتنے [illegible]" [illegible] نے پیر پھیر کھینچے ہوئے
[illegible] جسم کا [illegible] ـــــ [illegible] ـــــ سامنے [illegible]

۔ کریا ـــــ میرا چھوٹا بھائی بھی جیسے مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ میں نے
ں کے ہات کو زور سے جھٹکا دیا کمبخت کسی دم پیچھا نہیں چھوڑتے اور اقبال
۔ جا کر کھڑا ہو گیا اور ثروت کی بھدی شکل کو دیکھنے لگا۔

نسیمہ کی نگاہیں بھی ثروت کی آنکھوں میں پڑی ہوئی تھیں جیسے میرا اس
گھر میں کوئی حق نہیں بشادی کیا ہوئی ہے اکیلے کمرے میں پڑی سڑتی ہوں اور
کوئی پوچھتا نہیں کہ دو حرف بول لے اور میں پریشان ہو کر کمرے میں چلی گئی ـــــ

یہی نسیمہ جو ہر دم میرے کمرے میں پڑی رہتی تھی کتنا ہی کہوں پر ایک سکنڈ
کو پیچھا چھوڑ دے کتنا ہی ضروری خط لکھنا ہو مگر وہ سر پہ سوار اور آج یہ
حالت ۔ ۔ کر صورت سے بھاگتی ہے بس وہ تو ہر وقت ثروت آپا ـــــ

ثروت آپا ۔ ۔ ۔ میری نگاہوں میں پہلے والی نسیمہ پھرنے لگی۔

"آپا ـــــ آپا ۔ تمھارے بغیر میں نہیں رہ سکتی۔ تمھاری شادی بھی
ہو جائیگی تو میں تمھارے ساتھ رہوں گی ـــــ اس گھر میں تو ہرگز بھی نہیں
رہوں گی اس گھر میں سوائے تمھارے مجھے تو کوئی بھی ایک آنکھ نہیں بھاتا۔

اور یہ بڑھیا اماں دن بھر چلّی پکار مچائے رہتی ہیں"
"کیسی بات کر رہی ہے نسیمہ، چڑیں کہیں کی ۔

"تو اور کیا کہوں دن بھر تو جوان لڑکیوں پر تبصرہ کرتی ہیں ـــــ جوان
لڑکیوں کے یہ طور طریقے نہیں ہوتے وہ نہیں ہوتے ۔ ـــــ بیٹھو تو ایسے، اٹھو تو ایسے،
دن بھر کی دانتا کلکل ۔"

"اپنے بزرگ ایسی بات نہیں کرنی چاہئے" میں نے سمجھانے کی کوشش کرتے

ہوئے کہا۔

"اپنے بزرگ ہیں تو کیا کروں، سارے بزرگ ہمارے ہی گھر کے لئے تو رہ گئے ہیں —— ایک خالہ ہیں جو کبھی ہنسی خوشی سینما جانے ہی نہیں دیتیں اپنی ٹانگ اڑائے رہتی ہیں —— میں تو جوتی کے برابر بھی نہیں سمجھتی۔"

"بیکار باتیں کیوں کرتی ہے —— آخر بھائی جان تو ہیں کبھی سینما جانے کو منع بھی کیا ہے۔"

"بھائی جان بس ان کی بات تو مت کرو۔ کتنے روپئے کھا گئے میرے —— آج تک دھیلا نہیں دیا اور اب بھی جب کہتے ہیں تو یہی کہ دو روپئے ادھار دیدے پھر دیدونگا" بس میں تمھارے ہی ساتھ رہونگی۔"

کہاں تو یہ حال تھا اور اب ——

"ثروت آپا کی تصویر کھینچ گئی —— اہاہا ثروت آپا" اور میں جیسے کسی عمارت کی طرح اڑا اڑا دھم سے گر پڑی کھڑکی سے جو دیکھا تو جیسے نیمہ اور قیاں ثروت کو نئے جا رہے ہیں —— "ثروت آپا" "ثروت آپا" دریہ آوازیں دیر تک گھر کی چہار دیواری سے ٹکراتی رہیں —— جیسے کوئی بڑی بھاری کانفرنس ہی تو تھی جو ان کی جے اس طرح بولی جا رہی ہے۔ صبح سے یہ وقت آ گیا کان پک گئے سنتے سنتے ہر وقت ثروت آپا —— ان کا کوئی وقت بھی نہیں —— اور تیسرے تصویریں کو [illegible] کرنے کے بعد بھائی جان کی تصویروں کا البم کھولا جو ان کی خوبی ظاہر کرتی تھی۔ بھائی جان بھی بڑے شوقین ہیں کیسی کیسی تصویریں ہیں میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اب

اشد — جوان لڑکیاں اور بالکل — اور یہ جملہ میرا ذہن تک مکمل نہ کر سکا دروازے میں آہٹ ہوئی۔ میں چونک پڑی کہیں کوئی آ نہ جائے — میری نظر بہتے ہوئے پردے پر جم کر رہ گئی سینہ دھک دھک کر رہا تھا کوئی ہے تو نہیں اور میں نے جھٹ البم کو سرکا کر دراز میں رکھ دیا۔

"کوئی بھی تو نہیں آ رہا" میں نے سینہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے دھیرے سے کہا اور پھر دراز میں سے نکالا میرے ہاتھ کانپ رہے تھے اور میں نے جلدی جلدی البم کی ورق گردانی شروع کر دی۔ یہ فلمی ستاروں کا حصہ ہے۔ جو ستارے ہونے کے باوجود پستی سے نہ نکل سکے۔ مس نسیم، مس خورشید، مس نرگس اور مینا اور میری نظر تصویر کی گہرائیوں میں پہنچتی ہوئی ماضی کی یادوں سے ہم آغوش ہو گئی۔

"آؤ صفو آج "من کی جیت" دیکھنے آئیں"

"نہیں بھائی جان میں نہیں جاتی آج مجھے ایک کہانی نقل کرنی ہے پھر پرچہ رہ جائے گی"

"کہانی بھی تو نقل کرنی ہے بس میں آج کر دونگا — یہ فلم بڑی اچھی ہے۔ نسیم چند ستے ملکے ہیں ... پیر مغاں کے گیت "دنیا یہی دنیا ہے تو [illegible] ہے گی — اب تو میرے لئے کوئی اور راستہ ہی نہ تھا۔ خاموشی سے پرچے بھرے [illegible] کھینچتی رہ گئیں مگر میں بھائی جان اور نسیم [illegible] نسیم کو تصویر نے روک ہی لیا۔

اور [illegible] کے بعد جیسے یہ کوئی کہانی ہے میں گھبرا گئی دنیا بدل گئی ماضی کے

سپنے ٹوٹ گئے۔ بھائی جان بدل گئے کبھی سیدھے منہ تو بات کر کے نہیں
دیتے بس اب تو ہر وقت ثروت ـــــ ثروت ـــــ وہ کیا آئی کہ جیسے
گھر میں ایٹم بم آگیا، یا اللہ کیا ہوگا۔

"ثروت بیٹی کیا کر رہی ہو ـــــ ذرا میری چوٹی تو گوندھ دے" امی کی
آواز فضا میں لہرائی "ثروت بیٹی" جیسے ہم کچھ ہوتے ہی نہیں ـــــ اب کوئی
کام کرانا تو میں بھی کر کے دوں گی۔ بڑی آئیں ثروت بیٹی کہیں کی۔ جیسے جیسے
ثروت بیٹی ہی تو روز باندھتی تھیں۔ زندگی میں آج پہلی بار امی کی چوٹی گوندھنے
کی خواہش پیدا ہوئی۔ جیسے یہ الفاظ مجھ سے باز پرس کر رہے ہیں۔

یہ امی کی چوٹی بھی مصیبت ہے ہر روز کا کھیل تماشا ہو گیا اور پھر تیل
لگاؤ خشک کرو تو کہیں کام چلتا ہے۔

"اتنے زور سے بال ہیں اور تو ہی تین گھنٹوں سے ـــــ
ـ جنگل کی ونڈیوں سے کوئی کام بھی تو ٹھکانے کا نہیں۔ ختم کرنے بیٹھ جاؤ گی
تو دن بھر لگ جائیگا اور ایک کام بھی ختم نہ ہوگا۔

"ٹھیک سے گندھوانا ہو تو گندھوا لو" مجھے ضبط کرتے کرتے آخر غصہ
آ ہی گیا ـــــ "تمہیں کچھ بھی پتہ ہوتا ہے" یہ کیا سر رہی ہو گندگی سا۔

"ٹھیک سے تو بیٹھی ہوں تجھے نہیں باندھنا تو ویسے ہی کہہ دے ـــــ
جا اپنے چھوٹے بچے قصے کہہ صبح سے شام تک قلم دوات لئے کرتے رہیں جیسی دنیا
کسی کام کو کہو تو دماغ ہی نہیں ملتا" اور جیسے پاس دور کرنے سے کی

"تم تو ڈیڑھ بجے سنائی دے رہی ہو۔

ثروت بیٹی ــــ خدا تجھے نیک گھر نیک بر دے ــــ بس مجھ بڑھیا کا چونڈا تو تو ہی ٹھیک سے باندھتی ہے اور یہ طلو تو وہ کھینچا تانی لگاتی ہے کہ توبہ بھلی ــــ جیسے کوئی بیگار ٹال رہا ہو"

مجھے اپنے اوپر غصہ آیا کاش میں پہلے ہی سے امّی کے بالوں میں دلچسپی لیتی تو یہ دن دیکھنے نہ پڑتے جو کوئی پوچھتا تک نہیں۔

"ثروت آپا ــــ چلو کیرم بورڈ کھیلیں" نسیمہ کی آواز آئی۔

"جاؤ طلو آپا کے ساتھ کھیلو میں امّی کے بال ٹھیک کر رہی ہوں"

"طلو آپا کے ساتھ ابھی نہیں میں تو نہیں کھیلتی ــــ انھیں تو پڑھنے لکھنے ہی سے فرصت نہیں جب کہو کہ آؤ آپا ایک بورڈ بس ایک بورڈ کھیل لیں ــــ تو جواب ملتا ہے "جا پڑھ اپنے کمرے میں" اب کوئی ان کی طرح کہاں تک پڑھے جب دیکھو جب کوئی کتاب آنکھوں سے لگائے رہتی ہیں مجھ سے تو یہ نہیں ہوتا" جیسے ایک سانس میں سب کچھ کہہ ڈالے گی ــــ

"اچھا آتی ہوں۔ تم چلو ابھی آئی ــــ ذرا چوٹی پوری کر لوں"

"آہا ہا ہا ــــ ثروت آپا کھیلیں گی" اقبال کی آواز سنائی دی۔

اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ کاش ان تمام کتابوں کو آگ لگا دیتی ــــ اور دن بھر کیرم کھیلتی کمبخت نسیمہ کتنے بورڈ اس کے ساتھ کھیلے۔ احسان فراموش کہیں کی' اور میرا غصہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اور میں بستر پر دھڑام سے گر پڑی ــــ نہ جانے کتنی دیر روتی رہی ــــ اور پھر جیسے کسی بیابان میں بال کھولے کسی جوگن کی طرح بے سروسامان دوڑ رہی ہوں۔ جس کا کوئی

پرسان حال نہ ہو، آسمان کے تارے جس کو راہ دکھاتے ہیں اور شفق کی لالی جس کو دھوکا دیتی ہو ــــــ اور اس بیابان میں نہ جانے کتنی دیر یاں لہراتی رہی ــــــ

"طلو بن اٹھو شام ہوگئی" جیسے کوئی دور سے مجھے آوازیں دے رہا ہو۔ یک نصائی آواز ــــــ

"کون ہے؟" میں چونک پڑی۔ بھابی سامنے کھڑی تھیں ان کے ہونٹ لرز رہے تھے اور آنکھیں ساون کے بادل کی طرح لہرا رہی تھیں ــــــ جن سے نہ جانے کتنا پانی برس چکا ہو اور کتنا برسنے والا ہو۔

"کیا ہے بھابی رو رہی تھیں کیا؟"

"نہیں تو ــــــ تمھیں اٹھانے آئی تھی۔ تمھارے بھائی جان کا نیا سوٹ کہاں رکھا ہے؟"

"نیا سوٹ کیا ہوگا بھائی جان نے نیا سوٹ تو کشمیر جانے کے لئے رکھا ہے۔"

"نہیں سنیما جا رہے ہیں ثروت کے ساتھ" اور میں جیسے کسی طویل نیند سے جاگ گئی ــــــ ثروت ــــــ ثروت ــــــ جیسے در و دیوار سے یہ صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔

"بھائی جان سنیما جا رہے ہیں ــــــ تم نہیں جاؤ گی ضد کرو" اور بھابی نے نظریں جھکا لیں اور جھکی ہوئی آنکھوں سے جیسے ثروت کی شکل دکھائی دینے لگی تھی۔

"میں نہیں جاؤنگی ـــــ اچھا تم سوٹ دو" بھابی کی آنکھیں آنا جھک
گئی تھیں کہ اُن کی پلکیں میری نظر سے اوجھل ہوگئیں ـــــ لیکن ٹپ سے پیر
کے پاس ایک بوند گری اور بھابی نے چونک کر اس کی طرف اس طرح دیکھا کہ
جیسے اس کو اٹھا لی تو میں گی اور وہ تارے جو اب تک پلکوں کے سہارے
رکے ہوئے تھے زمین پر موتیوں کی طرح بکھر گئے اور آکاش پر جیسے گھٹا چھائی
ہوا تارے ٹمٹما رہے تھے۔

میں نے دراز سے سوٹ نکال کر اُن کے ہات میں دیا اور کچھ کہہ نہ سکی۔
چلو میرا ہمدرد تو اس گھر میں پیدا ہوا میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

ذرا سی دیر میں بھائی جان کا کمرہ خالی ہوگیا ـــــ ثمرت سینما جا چکی تھی
خالہ بی کی آوازیں سمندر پار ستاروں سے آگے والے جہاں میں گونج رہی
تھیں جو مجھ تک نہ پہنچ سکیں ـ میں خاموشی سے بھابی کے کمرے میں جا کر کرسی
گھسیٹ کر بیٹھ گئی اور بھابی تو جیسے گھنٹوں سے بے خبر پڑی سو رہی تھیں ـــ
ـــ ایک پرسکون نیند ـــــ جس میں سانس بھی خاموشی سے ہوا میں تحلیل
ہوتا ہے۔ کمرے کی فضا رات کے اندھیارے کا اس کی آمد سے پہلے ہی خیر
مقدم کر چکی تھی ـــــ اور جب رات آ گئی گویا ہم سب خواب دیکھ
رہے تھے۔ رات کی تاریکی میں آکاش کے تارے بادل کے گالے کی نذر ہوگئے
تھے ـــــ اندھیرا گھٹا ٹوپ اندھیارا ـــــ

یہ اندھیرا بڑھتا جاتا ہے پھر چراغ جلا رات ہوئی اور صبح کی
لالی آگئی لیکن ثمرت کی بیرونی تھی دن بھر اس کا وظیفہ پڑھا جاتا بس۔

میں اور بھابی ایسی تھیں جو الگ تھلگ پڑی رہتیں ـــــــ اور ثروت ہیروئن ہونے کے باوجود کسی بڑے المیہ کا ایک کردار معلوم ہوتی اسکی آنکھوں کی اداسی بڑھتی جارہی تھی، جب آئی تھی تو کون سی ہنس مکھ تھی مگر اب تو روز بروز اسکی آنکھوں میں تفکر کے آثار پائے جاتے تھے ـــــــ ثروت کی آنکھیں، گویا زمانہ کی اُداسی ان ہی آنکھوں میں جذب ہوگئی ہے اور بھائی جان تو دن بھر " دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی، کرتے رہتے صبح سے شام تک یہی مصرع ان کی زبان پر رہتا اور وہ اس کو اتنا خوش ہوکر گاتے گویا شاعر نے دنیا کے تمام عیش و عشرت کو اس شعر میں غرق کردیا ہے ـــــــ اور دن بھر ثروت کا وظیفہ پڑھتے۔

"بے ماں کی بچی کا دل رکھنے کے لئے ڈھونڈا کتنا ہلکان ہو رہا ہے"

اُمی کا فیصلہ تھا جس سے وہ بیحد بے چین تھی "بچارا کتنا خیال رکھتا ہے"

"امی کیا کروں بے ماں کی بچی ہے بچاری ـــــــ تمھیں بھی خیال رکھنا چاہیئے، اس کی بہن کو تو فکر ہی نہیں"

اور بھابی کی تو جیسے بہت ـــ میں زندہ ہیں۔ مجھے اس پر بہت غصہ آیا ـــــ دیکھنے میں تو کتنی معصوم دکھائی دیتی ہے منحوس کہیں کی۔

آخرکار بھائی جان کی میز پر ثروت کی تصویر آ ہی گئی میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس کو فریم سمیت باہر پھینک دوں ـــــ اور بھابی کی نظریں تو اس تصویر کو دیکھ کر جھک گئیں۔ اور وہ دیر تک اسی طرح بیٹھی رہیں ـــ

ایک دن میں جو کمرے میں گئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ بھابی
بستر میں پڑی رو رہی ہیں ــــــــ تکیہ آنسوؤں سے تر ہو گیا
ہے دوپٹہ الگ پڑا ہے اور وہ الگ، مجھے آتا دیکھ کر چادر اوڑھ لی۔
" بھابی ــــــــ ؟" اور میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی گویا
میں سمجھتی تھی کہ ان کے رونے کی کیا وجہ ہے اور میں نے بھابی کہہ کر
اپنی تمام قلبی کیفیات کو اس میں سمو دیا ــــــــ اور انھوں نے
آنسوؤں کے تار کے ساتھ آہستہ سے کہا:۔
" ثروت کی طبیعت خراب ہے"
" کیسی ہے ــــــــ مگر تمھیں کیا ــــ بڑے کو مرنے بھی دو" مجھے
غصہ آ ہی گیا اور میں یہ بھی نہ سوچ سکی کہ کس سے کہہ رہی ہوں آخر
کو بہن ہی ہے نا" لیکن ہوا کیا" میں نے اس تلخی کو کم کرنے
کی کوشش کی۔
" خدا جانے ــــــــ تمھارے بھائی جان اس کو ڈاکٹر
کے یہاں لے گئے ہیں"
" بھائی جان ــــــــ ڈاکٹر کے یہاں" میں چونک پڑی اور راستے
میں اقبال دوڑتا ہوا آیا اور مجھے دیکھ کر ٹھٹک سا گیا۔
" کیوں اقبال کیا بات ہے"
" کچھ نہیں ثروت آپا کہاں ہیں"
" ثروت آپا" میں کانپ اٹھی " کیوں کیا کام ہے کم بخت" میں نے

دوڑ کر اس کے منہ پر ایک تھپڑ مارا ——— " ہر وقت ثروت آپا، ثروت آپا" ——— میں غصّہ سے کانپ رہی تھی۔ اقبال کی چیخوں کی آواز کمروں میں گونج رہی تھی۔

" میں تو ثروت آپا کے لئے سوندھی مٹی لایا تھا اور آپ آئی ہیں مارنے۔" اُس نے آنسوؤں اور چیخوں کے ساتھ کہا اور جیسے اچانک جاہلی کے آنسوؤں نے اُن کی پلکوں کا سہارا لیا ہو ——— وہاں سے کھڑے اس ہولناک منظر کو دیکھ رہے ہوں، تارے ٹمٹما رہے تھے اور مجھے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔

بھنور

"باجی ——" وہ میز پر سجے ہوئے گلدان میں ولایتی مٹر کے تازہ پھولوں کا مہکتا ہوا گچھا لگاتے ہوئے بولی۔ زہرہ کی آنکھیں کتاب پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ نہ بولی۔ شاید اس نے سنا بھی نہیں۔

"باجی ——" اس نے پھر کہا اور بڑھ کر زہرہ کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا ہے؟" زہرہ نے گلشن کی طرف دیکھا۔ اسکو تو ادھر ادھر کی فضول باتیں کرنے کی کچھ عادت سی پڑ گئی ہے جیسے بغیر باتوں کے اس کا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔

"باجی —— ایک ہفتہ کی چھٹی مل جاتی تو ——" وہ کہتے کہتے رک گئی اور مسکرانے لگی۔

"کیوں؟ —— گھر یاد آ رہا ہے؟"

"نہیں تو اور ———" حسبِ عادت وہ پھر مُسکرائی۔

"کچھ کہے گی بھی۔ یا بتیسی ہی نکالے جائے گی" اور زہرہ بھی اُس کے مُسکرانے پر ہنس پڑی۔

"بائی جی ——— یہاں ایک بڑے اللہ والے بجرگ آئے ہوئے ہیں۔ ذرا اُن کے پاس جاؤں گی"

"اللہ والے؟" زہرہ نے کتاب بند کرکے پیر پر رکھ لی "کہاں آئے ہیں؟"

"یہیں ——— چوراہے کے اُدھر جو مسجد ہے نا ——— بس وہیں"

"پگلی ——— کوئی ایسا ہی ہوگا۔ ہوا ٹھگ" زہرہ نے ہونٹ بچکائے۔

"نہیں بائی جی ———" گلشن نے دانتوں تلے زبان دبالی "تراب شاہ ہیں۔ بڑے پہونچے ہوئے پیر"

زہرہ چونک پڑی اور کچھ سوچنے لگی۔ ان کا ذکر تو اس نے بھی سنا ہے۔

"نام تو تم نے بھی سنا ہوگا۔ بائی جی ———" گلشن نے دیکھا کہ زہرہ بھی اُسکی باتوں میں دلچسپی لے رہی ہے تو وہ اور بھی پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی "رات کلو نے بتایا" گلشن نے بڑے رازدارانہ انداز میں ادھر ادھر دیکھ کر کہا "شاہ صاحب کے جنّات ہیں۔ وہیں ٹھہرے ہیں۔ مانگے سے جو کچھ مانگتا ہو" ہنسی بار بار اس کے ہونٹوں پر ناچ رہی تھی ...... "اُس کا جمّو اچھا ہو جائے گا ——— اُس کا اکلوتا۔ بچہ کتنی منتوں مرادوں کے بعد اللہ نے دیا تھا۔ پر ایک ٹھیکرا سو وہ بھی ٹوٹا ہوا۔ جب وہ چھ مہینے کا ہوا تو اسکے پیروں کو کسی بلا نے مروڑ دیا اور اب وہ چھ سال کا ہو چکا تھا۔ اسکی بس یہی آرزو تھی کہ اپنے جمّو کو پیروں چلتا دیکھ لے۔

"تو نے جمو کو کسی حکیم ڈاکٹر کو نہیں دکھلایا؟"

"بہتیری دوا دارو ——— گنڈے تعویذ سب کچھ تو کئے۔ مزاروں مزار لئے لئے پھری۔ پر کچھ بھی تو نہ ہوا۔" گلشن نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اللہ جانے کس کی ٹوک لگی تھی۔ میں نے تو کبھی کسی کا برا بھی نہ چاہا ——— "گلشن نے ہاتھ ملے اور باہر کی جانب دیکھنے لگی۔" ایسا چاند سا بچہ تھا جیسے چار گھڑی دیکھے بولنے آوے تھی۔ اس کے ابا بہتیر کہتے کہ ادھر ادھر بیکرنہ کھڑی ہو کر پر مجھ کمبخت نے ایک نہ مانی۔ اب ہاتھ ملوں ہوں۔"

"تو جمو کو دکھانے لے جائے گی؟"

"ہاں ہاں ——— انہیں بھی دکھاؤں۔ کیا خبر جو اللہ نے انہیں کے ہاتھ شفا رکھی ہو۔" وہ اپنی انگلیاں مروڑنے لگی۔ "دور پھر یوں ہے سنا ہے ——— کتنے ہی دکھیوں کا روگ کاٹ دیا۔ ہاں جی جو مرد بھی ہو تو بنتی ہے بس میرے جمو کے پیر اچھے ہو جائیں اور مجھے کچھ نہیں چاہئے۔" گلشن کھڑی ہو گئی۔

"تو میں جاؤں ———؟"

"اچھا ———"

زہرہ نے حیرت سے گلشن کو دیکھا۔ وہ جیسے کسی مرثیہ کا کوئی بند پڑھ رہی تھی۔ زندگی کے موڑ پر اس گلشن کی بھٹکنے سے [illegible] معصوم [illegible] اوٹ پٹانگ باتیں کرتی ہے جن کا نہ سر نہ پیر۔ جب بھی [illegible] ہے یہ نگوڑے [illegible] کرتی ہے عجیب عورت ہے۔ تب گلشن بڑھ کر [illegible]

جہاں سے کہانی چھوڑی تھی پھر وہیں سے شروع کردی۔ وہ ایک صفحہ پڑھ گئی پر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اُس نے پھر نظر اُسی صفحہ پر ڈالی۔ مگر اب بھی اس کی سمجھ میں خاک نہ آیا۔ جی معلوم نہیں کیوں آپ ہی آپ گھبرا رہا تھا جیسے وہ اپنا سب کچھ کھو چکی ہو اور اب اس کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے بےچین ہو رہی ہو۔

ہاں ـــــ وہ اپنا سب کچھ کھو چکی تھی۔ اپنی راتیں، اپنے دن، اپنا جیون ـــــ اب تو سچ مچ کچھ بھی اُس کا نہیں تھا۔ مگر نہیں تھا کیوں نہیں۔ ناکامی اس کی تھی، اُداسی اُس کی تھی، آنسو اُس کے تھے۔ کتنے دنوں سے اُس نے صبح نہیں دیکھی ـــــ اس کی آنکھیں دن کی روشنی کو ترس گئیں۔ معلوم نہیں اس کی طرح کتنی عورتیں ہوں گی جن کی دنیا ہی اس کالی اندھیاری میں بنائی گئی ہے ـــــ اندھیرا ـــــ اندھیرا ـــــ ہر چیز سیاہی سے پتی ہوئی۔ کتنی بجلیاں جلتی ہیں پر کچھ بھی سُجھائی نہیں دیتا۔ کالی کالی راتیں بجلی کی روشنی سے کہیں دن بنائی جا سکتی ہیں۔ اس سنسار میں کبھی صبح نہیں ہوتی کبھی دن نہیں نکلتا۔ سدا سے ایسا ہی اندھیرا ہے۔ پہلے مدھم مدھم چراغ جلے، پھر لیمپ اور بجلی سے اس کو روشن کیا گیا۔ پر کیا ہوتا ہے اس بجلی کی طاقت ہزار گنا بھی بڑھا دی جائے تو کہیں تب دن نہ ہو سکتی ہیں ـــــ یہ اندھیارا کبھی دور ہو سکتا ہے۔ البتہ بجلی کی سفید سفید روشنی، ہر چیز عارضی طور پر چمک اٹھتی ہے جیسے آسمان پر بجلی چمک کر کالے کالے بادلوں میں چھپ جائے ـــــ پھر اندھیرا گھُپ ـــــ کالے کالے پہاڑ۔ جیسے ساری دنیا سمٹ کر ایک کالا پربت بن گئی ہو۔

"بائی جی ——— " زہرہ چونک پڑی "کون ہے؟" کمرے میں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا اس نے بجلی بھی نہ جلائی تھی۔ جھٹ اٹھ کر سوئچ دبایا۔ ہر چیز جگمگا اٹھی، ریشمیں پردے، رنگین قمقمے، میز پر سجے ہوئے گلدستے پر اسکے دل کی تاریکی اور بڑھتی جارہی تھی۔

"میں سمجھی بائی جی کہیں چلی گئیں، جو اندھیرا پڑا ہے" اور پھر جلدی سے بولی "بائی جی ——— اونچے والے پیر جی آئے ہیں"

"کہہ دو ——— سر میں درد ہے آج کسی سے نہیں مل سکتی"

نوکرانی چلی گئی، زہرہ پھر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ اس کو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سچ مچ سر میں انتہائی درد ہو۔ کوئی ہڈیاں توڑ رہا ہو ——— بڑے ——— بڑے ——— بڑے ——— بھاری بھاری پیر اس کا جسم کچل رہے تھے۔ کالے کالے دیو اس پر چڑھ رہے تھے۔ جنھوں نے جسم کو روند ڈالا تھا۔ وہ جاگ رہی تھی جیسے کوئی ڈراونا خواب دیکھ رہی ہو یہ خوفناک خواب اسکی زندگی کا جزو بن چکے تھے ——— یہ نیلے کالے پربت، ان کے نیچے وہ مدت ہی سے دبی ہوئی تھی۔ برس گزر گئے وہ اپنے سکھ کے دنوں کو کبھی کی بھول چکی تھی۔ اس کو ٹھیک سے یاد بھی نہ تھا جب اسکی سہیلیوں نے اُسے سجا بنا کر دلھن بنایا تھا۔ اس وقت نہ جانے کیوں اس کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ بڑی بوڑھیوں نے سر پہ ہاتھ پھیرے، طرح طرح کی دعائیں دیں، اسوقت اسکی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ کون جانے یہ آنسو خوشی کے تھے یا غم کے۔ ڈولے میں بیٹھتے وقت وہ اپنی ماں کو لپٹ کر رونے لگی۔ بچپن میں جب بھی وہ ضد

کیا کرتی تھی تو اسی طرح ماں کو پٹ کر رونے لگتی تھی اور ماں اُس کی ہر ضد
پوری کر دیتی تھی پر آج اس کا دل بھی کس قدر سخت ہو گیا تھا ـــــــ پتھر کی
مانند۔ وہ آنکھوں سے آنسو لنڈھا رہی تھی جیسے کوئی چلّو بھر بھر کے پانی پھینک
رہا ہو پھر بھی ماں نے اس کی ضد پوری نہ کی ـــــــ
شاید امی کچھ کہنا چاہتی تھیں پر ان کی آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔ اس
وقت سب ہی کی آنکھوں میں آنسو تھے معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی جنازہ اُٹھ رہا ہو
سچ بھی ہے، لڑکی کا زندہ جنازہ ہی تو گھر سے نکلتا ہے۔

پھٹ ـــــ پھٹ ـــــ پھڑ پھڑ ـــــ ذکرنی اپنے پھٹے لیترے
گھسیٹتی داخل ہوئی۔
"بائی جی ـــــ" وہ بات کہنے بھی نہ پائی تھی کہ زہرہ تڑخی "کہہ دو ـــ
ـــــ میں نہیں مل سکتی" اور پھر تکیہ دوہرا کرکے سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گئی۔ وہ
کیسا حسین خواب دیکھ رہی تھی۔ ہاں خواب ہی تو تھا۔ اس کا ماضی کتنا اچھا تھا
کاش وہ اپنا حال بھی ایسا ہی بنا سکتی۔ مگر وہ نا امید نہ تھی۔ شاید اس کے
دن پھر لوٹ آئیں۔ ہاں وہ سکھ تو کہاں ـــــ اس کا گھر اُجڑا ـــــ
سہاگ لٹا ـــــ اور پھر سوچتے سوچتے اس کا دماغ بیکار ہو گیا ـــــ نہیں
ـــــ نہیں مجھے کچھ یاد نہیں۔ اُس نے دانت پیسے جیسے ساری دنیا کو چبا
ہی تو ڈالے گی اور پھر اس کے سامنے ایک شاہ صاحب کی تصویر آگئی زرد پوش
سفید ریش بزرگ ـــــ وہ کہہ رہے تھے "اُٹھ اب تیری دنیا میں اندھیرا نہیں رہا"

ــــ زہرہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی ــــ کیا میں اس دوزخ سے نکل سکوں گی
یہ خدا ترس بزرگ میری مدد کریں گے ــــ ایک فاحشہ کی مدد۔ اسکو ایسا
معلوم ہوا جیسے اس کی روح کے سارے تار جھنجھنا اُٹھے۔ یہ لوگ کیا کہیں گے
چار پیسے کی چھوکری چلی ہے مذہب کی آڑ لینے۔ کہنے دو ــــ وہ ایک
فاحشہ ہے تو کیا ــــ پھر اس کے ذہن پر دُھندلے دُھندلے خاکے
پھیلنے لگے۔ ماضی کی تصویریں ناچتی ہوئی اُس کے سامنے آنے لگیں۔

آج زہرہ تنہا تھی ــــ اس کے کمرے میں کوئی نہ تھا۔ پھر بھی اُس
میں وہ اُداسی نہ تھی جو ہر روز مہمانوں کے باوجود اس پر چھائی رہتی تھی۔ وہ
خوش تھی۔ اس کا کمرہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی دوشیزہ کی خلوتگاہ ہے وہ
ٹھٹک کر بیٹھ گئی دھڑکتے دل سے باہر جھانکنے لگی جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو۔ انتظار
تو وہ روز ہی کیا کرتی تھی ــــ پر کس کا؟ یہ وہ خود بھی نہ جانتی تھی
اس کا جسم بیمار ہو چکا تھا پر روح پیاسی تھی۔ اس کو صرف ایک قطرہ چاہیے
تھا جو اس کی پیاسی روح پر چھڑکتا۔ وہ اپنے جسم کا ہر روز سودا کرتی
تھی پر اس کی روح کا آج تک بھی کوئی گاہک نہ آیا۔ کیا اس دنیا میں
صرف جسم ہی کے چاہنے والے ہیں۔ روح کا کوئی نہیں۔

اس کی نظریں باہر اندھیرے میں دور کسی کا تعاقب کر رہی تھیں۔ کیسا
اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھتا تھا۔ پھر دیکھتے دیکھتے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے
سیاہ چادر کو کسی نے چیر دیا ہو۔ ایک نورانی شکل نمودار ہوئی۔ جو ہاتھ کے
اشارے سے اس کو اپنی طرف بلا رہی تھی۔ شاید اس اندھیرے سے نکالنے

کے لئے۔ اور پھر اُسی اندھیرے میں، کالے کالے تودوں میں غائب ہوگئی ———
زہرہ دیوار سے کر ٹیک کر بیٹھ گئی۔ میں کل ضرور جاؤنگی ——— اب یہ
اندھیرا نہیں دیکھا جاتا۔ میرا دم گھٹ رہا ہے وہ مجھے ضرور اس پاپ بھری دنیا
سے نکال لیں گے۔ اللہ جانتا ہے میں پاپی نہیں ——— اس سماج نے
زبردستی مجھے اس دوزخ میں ڈھکیل دیا ہے ——— اس نے بجلی بجھا
دی، لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی کمرہ میں کپکپا رہی تھی۔ دیواروں پر سائے سے
چلتے دکھائی دے رہے تھے۔ زہرہ کو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سچ مچ وہ
اپنی مرادوں کو پا چکی ہو۔ اس نے کھڑکی کے باہر دیکھا ابھی رات کافی ہے
اور وہ پھر تکیہ میں سر گڑو کر پڑ رہی۔

صبح سے کتنے آدمی آ چکے تھے۔ بلاوے پر بلاوے آ رہے تھے ———
کبھی "لال پگڑی" تو کبھی "سہرا دھرہ" کبھی "کلاہ تاتاری" تو کبھی "ہوائیں پھر
پھراتی ہوئی چھتی" ——— آخر کو نواب صاحب کے لڑکے کی شادی تھی
نا۔ پر زہرہ نے طے کر لیا تھا، وہ ہرگز ہرگز نہ جائے گی۔ وہ اس جیون سے
اکتا گئی تھی اس کو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے دنیا کی ہر چیز اس سے نفرت
کر رہی ہے۔ ہاں ——— وہ لوگ بھی تو اس کو حقارت کی نظر سے
دیکھتے ہیں جو رات کی مدھم مدھم روشنی میں اس پر مرتے ہیں، اس کے
کانوں میں جیسے کسی نے سیسہ بھر دیا ہو۔ وہ سب کچھ سنتے ہوئے بھی کچھ نہیں
سنتی ——— یہ لوگ پاگل ہیں پاگل ——— کیسا عشق ——— کیسی محبت۔

سو رہے ہیں، جب جاگیں گے تو معلوم ہوگا ـــــ یہ روٹی ہے روٹی ـــــ پیٹ کے کارن یہاں عشق کا ڈھونگ رچایا جاتا ہے۔

جب وہ پہلے پہل اس اجنبی زندگی میں داخل ہوئی تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کو کوئی کانٹوں میں گھسیٹ رہا ہو۔ اس دوزخ کے لئے انسان کیا کچھ نہیں کرتا۔ ہاں ـــــ اسی لئے تو اُس نے بھی ان کانٹوں میں گھسٹنا پسند کیا۔ پسند ہی کیا تھی، وہ مجبور تھی اور اب اس دو تین سال کے اندر اس نے اپنی اس نئی اجنبی زندگی کو پُرانا بھی کر لیا تھا۔ نہ کرتی تو کیا کرتی ـــ پیٹ بھر روٹی ملنا بھی تو آسان نہیں۔ پھر یہ بحرانی دور۔ زہرہ سوچتے سوچتے گھبرا اٹھی۔ اُس نے بچپن سے اب تک کتنوں کو اپنا دل، اپنا دماغ بیچتے دیکھا تھا۔ پر جسم بیچتے کسی کو نہ دیکھا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ عجیب سودا آ بھی نہ سکتا تھا۔ بھلا یہ بھی کوئی سودا ہے۔ ہر روز دکان لگے ـــــ سڑی سوکھی مٹھائیوں پر چمکدار چاندی سونے کے ورق چپکے ہوئے ـــــ پھر سر بازار سودا چکایا جائے۔ آج اسکو اس تصور سے قے آنے لگی۔ چھی ـــــ چھی ـــــ کتنی گندی زندگی ہے۔ اب وہ اس زندگی میں ہرگز نہیں رہ سکتی۔ وہ آج ہی شاہ صاحب کے پاس جائے گی اور ان کو گواہ کر کے خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگے گی۔ کیا خدا اس کو معاف نہ کریگا ـــــ کیا وہ اتنا بے رحم ہے ـــــ نہیں، پھر اس کے دن پلٹ آئیں گے۔ پر میں کتنی پاپی ہوں۔ میں نے کتنے گناہ کئے ہیں۔ میرا دل ان گناہوں میں جکڑا ہوا ہے مگر میری روح، وہ پاک ہے ایک معصوم بچے کی طرح اسکی آنکھوں

کے سامنے خاکے سے گزرنے لگے۔ یہ لوگ وہ ہیں جو اس کے یہاں ہر روز آتے ہیں جنھوں نے اس کی دوشیزگی کو لوٹا ہے اور اب اس کی جوانی کو کچل رہے ہیں وہ کہہ رہی تھی —— آؤ —— آؤ —— لوٹ لو میری ساری پونجی —— لوٹ لو —— مگر میری روح اس کو ہاتھ مت لگانا۔ وہ امانت ہے، باقی جو کچھ ہے سب لے جاؤ اور جلدی ختم کر دو تاکہ تمھارے پُر ہوس کلیجے ٹھنڈے ہو جائیں۔ اس نے ایک گہری سانس لی، یہ سماج کے ٹھیکیدار ہیں، انھیں کے بنائے ہوئے قانون پر دنیا کا نظام چلتا ہے۔ طوائف بھی دیوی تھی۔ شریف گھرانے کی بہو، بیٹی، لیکن انھی کے بنائے ہوئے قوانین نے اس کو چلمن سے نکال کر بازار لا بٹھایا۔ اور آج کتنا سستا ہے اس کا سودا۔

"بائی جی —— یہ چٹھی ہے۔"

"کون لایا ہے ——؟"

"نواب صاحب کا آدمی۔ ——"

زہرہ نے چٹھی ہاتھ میں لے لی اور بغیر کھولے ہی پرزے کو کھڑکی سے باہر پھینک دی۔ کاغذ کے پرزے سفید سفید تتریوں کی مانند ہواؤں میں اڑتے ہوئے نظروں سے غائب ہوگئے۔ زہرہ نے دانت پیسے ——

"اس سے کہدو میں نہیں جا سکتی —— جاؤ۔"

نوکرانی چلی گئی۔ زہرہ نے گھڑی کی طرف دیکھا —— ٹن —— ٹن —— ٹن۔ رات تین بج گئے۔ گلشن کہتی تھی شاہ صاحب اسی وقت ملتے ہیں۔ اس نے ایک بار اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی۔ ٹھیک تو ہیں۔ آج ہی تو نہا دھوکر تبدیل

کئے تھے، میز پوش، چادریں، پردے، فرش سب ہی تو بدلوائے تھے صندل
کی ہلکی ہلکی خوشبو کمرہ میں پھیلی ہوئی تھی وہ آئینہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔
آج وہ کتنی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی ——— "معصوم مریم"

وہ کتنی دیر آئینہ کے سامنے کھڑی رہی، دیکھتے دیکھتے اس کی صورت
غائب ہو گئی اور اس کی جگہ ایک دُبلی پتلی عورت کھڑی دعائیں دے رہی
تھی۔ یہ اُس کی ماں تھی۔ پھر ایک شریر بچہ دوڑتا ہوا آیا۔ یہ اُسکا چھوٹا بھائی
تھا اور پھر ایک خوبصورت مرد مسکراتا ہوا آیا یہ اس کا شوہر تھا ———

"بائی جی ———" زہرہ چونک پڑی۔ سب شکلیں غائب ہو چکی
تھیں۔ خادمہ سامنے کھڑی تھی۔

"فرصت نہیں کمرہ کام سے جا رہی ہوں۔" خادمہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی
چلی گئی۔ آج زہرہ خوش تھی اور مطمئن۔ اس نے چادر سے اپنے جسم کو اچھی
طرح لپیٹ رکھا تھا۔ وہ زمین پہ نظریں گاڑے چپ چاپ جا رہی تھی۔ جب کوئی غیر
اس کے قریب سے گزرتا تو بجلی سی تڑپتی اس کے گالوں پر دوڑ جاتی۔ وہ اپنے حال
کو بھول کر ماضی کو دُہرا رہی تھی۔

وہ چوراہے کے قریب جا کر رک گئی۔ معلوم نہیں جامع مسجد کو کونسا راستہ
جاتا ہے یہاں تو تین سڑکیں ہیں ——— تین مختلف راستے۔ انسان کو زندگی
میں مختلف راستوں سے گزرنا پڑتا ہے کبھی وہ صحیح راستہ پہ لگ جاتا ہے
اور کبھی غلط پر۔

"بھیّا ——— جامع مسجد کو کونسا راستہ جاتا ہے" اس نے ایک نوجوان

مریل چڈان والے بنئے سے پوچھا جو قریب ہی ایک مٹھائی کی دوکان پر چاروں شانے چت پڑا پھائیں پھائیں کر رہا تھا اور مکھیاں اس کے ہر طرف بھن بھنا رہی تھیں۔

"یہی سامنے والی سڑک ہے" اس نے بمشکل سانس روک کر جواب دیا۔

زہرہ خوشی خوشی آگے بڑھ گئی۔ تھوڑی ہی دور چلی ہوگی کہ مسجد کا مینار دکھائی دینے لگا ـــــ اور وہ اس مینار کے سہارے چلنے لگی۔

"وہاں تو بڑا مجمع ہوگا" وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی۔ "ہزاروں مرادیں مانگنے آئے ہونگے عورتیں، مرد، بچے، سب ہی ہونگے بزرگوں کی زیارت نصیب والے ہی کرتے ہیں۔ زہرہ کا ذہن یکے بعد دیگرے ہزاروں شکلیں بنا رہا تھا۔ آخرکار اس کے سامنے وہی سفید ریش نورانی شکل بزرگ آ کھڑے ہوئے۔

"میں بھی ایک مراد لے کر آئی ہوں"

"بول کیا چاہتی ہے۔ خدا تیری مراد پوری کرے گا"

"میں ـــــ میں ـــــ"

"ہائے ـــــ یہ ہے ـــــ نواب صاحب والی رنڈی"

زہرہ چونک پڑی۔ سفید ریش بزرگ غائب ہوگئے۔ دو عورتیں اپنے گھروں کے سامنے کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔ جن میں سے ایک نے ناک پر انگلی رکھ کر آنکھ سے اشارہ کرکے یہ جملہ کہا تھا اور پھر دوسرے نے بھی تعجب سے کہا۔

"ہائے ـــــ ہے ـــــ یہ ہے۔ رنڈی نے بھرا بھتولا گھر برباد کر دیا۔ اسکی صورت پر جھاڑو پھرے، دیکھا ہو آٹھ آٹھ آنسو رو دے ہے"

زہرہ کے دماغ میں جیسے انجن چل رہے ہوں۔ وہ سنتی ہوئی آگے بڑھ گئی سرخ مینار اب بہت بڑا دکھائی دے رہا تھا مسجد کا دروازہ سامنے ہی تھا۔ "کتنی بڑی مسجد ہے" وہ سوچنے لگی۔ "لوگ دور دور سے اس کو دیکھنے آتے ہیں۔ ہاں ایک دفعہ وہ خود بھی تو آئی تھی۔ پر اس کو اندر جانے کی اجازت نہ ملی تھی۔ عورتوں کو اندر جانے کی اجازت نہیں۔ خدا کے یہاں بھی عورت اور مرد کی تفریق۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔

سامنے مسجد کی سیڑھیوں پر کچھ لوگ کھڑے تھے۔ زہرہ رک گئی۔ اس کی نظریں شاہ صاحب کو تلاش کرنے لگیں۔ "اندر ہوں گے" یہ سوچ کر وہ آگے بڑھی۔

"اجازت نہیں ہے۔" ایک آدمی نے دونوں ہاتھ پھیلا کر زہرہ کو روکتے ہوئے کہا۔

"کیوں ——؟ میں شاہ صاحب کی زیارت کیلئے آئی ہوں۔"

"زیارت کے لئے۔" وہ شخص ہنسا اور اس کے ساتھ اور لوگ بھی ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر ہنسنے لگے۔ بھلا یہ بھی کوئی نئی بات تھی کتنے لوگ زیارت کے لئے آتے ہیں۔ کوئی بھی انکو دیکھ کر نہیں ہنستا۔ مگر زہرہ ہی میں کیا کوئی نئی سی بات تھی۔ سب ہی مرادیں مانگنے آتے ہیں۔ وہ بھی مراد مانگنے آئی تھی۔ ایسی مراد جو اوروں کی مرادوں سے مختلف تھی۔ کوئی اولاد مانگتا ہے، کوئی زندگی مانگتا ہے، کوئی دولت مانگتا ہے۔ لیکن اسے ان میں سے کچھ نہیں چاہئے تھا۔ اسکو تو صرف ایک سہارے کی تلاش تھی جو اس کے ماضی کو لوٹا دے۔

زہرہ پھر آگے بڑھی —— مجمع میں ایک شور ہوا۔

"ہو —— ہو —— طوائف اندر نہیں جا سکتی مسجد ہو جائے گی"

راکھ ہو جائے گی۔ حضور کا حکم نہیں۔"

زہرہ رک گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ کچھ سن سکتی تھی۔ البتہ اس کے دل کی دھڑکن جیسے گھڑی چل رہی ہو ـــــ کھٹ ـــــ کھٹ ـــــ کھٹ۔ یہی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

"ہائے تو ـــــ اب تو رنڈیں بھی زیارت کو آنے لگیں"

"توبہ چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔ ابھی کیا تھا۔ ایسی ایسی عورتیں آنے لگیں تو بس اللہ کے گھر کا اللہ مالک ہے۔"

"اے بھائی شاہ صاحب کی زیارت کیلئے تو شریف زادیوں تک کو اجازت نہیں۔ سنا نہیں کہ ایک دفعہ کوئی عورت مردانے بھیس میں آگئی تھی تو وہیں جلکر راکھ ہوگئی۔ جو عورتیں آتی ہیں باہر ہی سے مرادیں مانگ کر چلی جاتی ہیں ـــــ اور یہ تو پھر رنڈی ہے۔ ان کسبیوں کو کون منہ لگاتا ہے۔"

زہرہ نے آنکھیں کھولیں وہ مسجد کی سیڑھی پر پڑی تھی۔ سر گھوم رہا تھا سارا جسم جیسے کسی نے روند ڈالا ہو۔ اس نے بمشکل سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ کچھ لوگ بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ زہرہ کو ہنسی آئی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ تب گنگا۔ ہوں، میرے پاپ کبھی نہیں دھوئے جاسکتے۔ ہائے میں کتنی نادان ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرا سینہ پاپ سے بھرا ہے میں یہاں آئی ایک مقدس ہستی کی زیارت کیلئے ـــ سپنوں میں کیسے کیسے سپنے دیکھتی ہوں، پر سپنے کبھی پورے نہیں ہوتے۔

اس کے قدم آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے۔ جیسے وہ سوں بوجھتے کہلا رہی ہے

زہرہ سیدھی سڑک پر خراماں خراماں چل رہی تھی نواب صاحب کی کوٹھی
سامنے ہی تو ہے۔ وہ رک کر سوچنے لگی اس نے ایک بار اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی۔
ٹھیک تو ہیں۔ پھر رومال سے چہرہ صاف کیا۔ ایک انگڑائی لی جیسے اپنے جسم کو
ہلکا کر رہی ہو۔ لوگ اس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے اور وہ بھی ایک
ادائے خاص سے مسکرا مسکرا کر چل رہی تھی۔ وہ اپنے ماضی کو بھول چکی تھی حال کو
خوشگوار بنائے گی۔ مستقبل اس کے سامنے سے ہٹ گیا تھا ———— ہنھ ———— سب
بیکار باتیں ہیں۔ فضول۔ لغو

وہ نواب صاحب کی کوٹھی کے قریب پہنچ چکی تھی۔ کتنی آنکھیں اس کی
طرف اشارہ کرنے لگیں۔

"نواب صاحب نے دعوت دی ہے" ایک لڑکی کہہ رہی تھی۔ سب چہ میگوئیاں
کرتے ہوئے بولے۔

"ارے تو کیا چیز ہے۔ تجھے کیا معلوم ایک ہزار روپیہ ہے۔ ایک ہزار روپیہ
آج تک دیکھے بھی نہ ہوں گے" ایک سکھ نے ہنستے ہوئے منہ سے جواب دیا۔

"بھائی ———— دس ہزار ———— ختم ہے آپ پر ... " ... دور
دور اس کے مقابلے کی اپنے دل میں غضب کی لڑائی ہے ————
جیسے جل پری پانی پہ تھرک رہی ہو۔ ایک لڑکی ہونٹوں پہ زبان
پھیرتے ہوئے بولی۔

زہرہ دروازے پر پہونچ کر رک گئی۔ بجلی کی روشنی اس کی آنکھوں کو چندھیانے لگی۔ پر اس کے جیون کے اندھیارے کو نہ مٹا سکی۔ رات کا اندھیارا بڑھ رہا تھا۔ سڑکیں سنسان، کالی چادر میں لپٹی ہوئی۔ پر نواب صاحب کی کوٹھی رنگ برنگے قمقموں سے جگمگا رہی تھی۔ ساز بج رہے تھے۔ ناچ ہو رہا تھا ——— زہرہ کا ناچ جیسے آسمان سے تارہ ٹوٹ کر بھنور میں آ پھنسا ہو۔

سورج کی تلاش ---------

بغیر کبھی گھر سے نہ نکلنا چاہئے۔ سو بیماریاں راستے میں ملتی ہیں۔ مگر فرید میاں
جب پولیس ہی سے نہیں ڈرتے تو بھلا اللہ میاں سے کیا ڈریں گے۔

سب ناشتہ میں لگے تھے اور فرید میاں لاپتہ۔ وہ تو بچوں کی چیخ و پکار
میں کسی کو خیال بھی نہ آتا کہ اتنے میں ——"

"انقلاب زندہ باد ——"

"لال جھنڈے کی جے ——" نے اعلان کردیا کہ ہو نہ ہو فرید میاں
مزدوروں کے جلوس میں جا دھمکے —— دیکھا تو سامنے خود ہی جھنڈا لہراتے
چلے آرہے ہیں۔

"یہ لونڈا تو بڑا خودسر کا ہوگیا ہے۔ چلے آرہے ہیں۔ تن بدن تک کا ہوش
نہیں۔ ان کا دماغ بھی یہ کہتا ہوگا کہ بس اماں جان کی گاڑی ڈھال
پر چڑھ گئی۔ اللہ دولت دے تو ٹھکانے کی۔ یہ بھی کیا سوری کا گوند لپیٹنے کا
نہ پوچھنے کا۔ ایک اولاد ہوتی ہوگی کہ ماں باپ کے کلیجے کی ٹھنڈک۔ ایک
یہ ہیں کہ گنواروں کی فوج لئے چلے آرہے ہیں۔ اسی دن کے لئے پیسہ مٹی
کیا تھا کہ پڑھ لکھ کے ماں باپ کی عزت گنوانا —— واہ بیٹا —— واہ"
وہ سر پکڑ کے بیٹھ گئیں۔ میرے دل میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی کاش
وہ اپنی تندرستی کا بھی کچھ خیال رکھے۔ نہ جانے کیوں میری آنکھیں آپ ہی
آپ نم ہوگئیں جیسے یہ آنسو ماضی کے ہمدرد اور مستقبل کا سہارا ہیں۔

میں بھی فرید کو سمجھاتی تو تھی پر اندر والا یہی کہتا —— وہ جو کچھ کرتا ہے
ٹھیک ہی تو ہے اور ہماری بہتری جو گھنٹوں کام کرنے کے بعد میرے پاس

غلام ——— آزاد

غلامی ——— آزادی

کون سی چیز بہتر ہے۔ وہ بیچاری اس کا کیا فیصلہ کرتیں۔ جبکہ خود پنڈت جی مہاتما جی دا قائد اعظم اس کا فیصلہ نہ کر سکے۔

فرید کا یہ کہنا کہ میں چلا جاؤں گا، کوئی نئی بات نہ تھی، جب دیکھو یہی دھمکی۔ یہ تو اب مشق ہوئی۔ بدمعاش دو مرنے کو —— یہ دھمکی بھی پچیسوں دفعہ دی گئی۔ مگر آج تک تو کیوں گئے نہیں اور یہ کیوں بھی خدا جانے کس قماش کی چیز ہے۔ جب سے دن فاقے ہی کی نوبت آتی رہتی ہے۔

"دیکھو —— شاہدہ بی —— کسی سے بتانا نہیں۔ آج ہمارے دو کامریڈ بھیا کھانا کھائیں گے۔"

"اچھا ... —— پر اس میں چوری کی کیا بات ہے۔ کتنے ہی مہمان روزانہ آتے رہتے ہیں۔ اب کچھ کمیں کی تھوڑا ہی۔ فرید جواب دیے بغیر ہی چلا گیا۔ فرید کی اس خاموشی کو اس وقت تو میں نہ سمجھ سکی، مگر آج سمجھتی ہوں کہ کتنی غیرتوں کی تہیں تھیں جنھوں نے اسے بجائے مجبوری کمایا —— فرید کو اپنی بے بسی کا احساس تھا۔

تقریباً ہر ایک کے پاس درجنوں سوٹ ہوتے مگر فرید کے پاس کل تین جوڑی کپڑے تھے۔ اس سے آگے دن تو تقسیم ہوتے تھے۔ اگر قارون کا خزانہ بھی ہوتا تو کہاں تک دیا کرتا۔ لیکن اس نے کبھی معمولی سے معمولی کپڑا بھی دیکھ کر یہ نہ کہا کہ میں لوں گا۔ بھائی جان کے قیمتی سوٹ دیکھ کر میرا جی چاہتا کہ کہہ دوں —— "فرید کے لئے ایک سوٹ کا کپڑا لا دو" پر آج تک ہمت نہ پڑی۔

اس کے بعد جھریا بغیر کام کئے ہی گھر چلی گئی۔ میں سمجھی کہ کچھ ناراض ہو گئی، اور پھر تین دن تک نہیں آئی۔ بعد کو پتہ چلا کہ مہتروں کی ہڑتال تھی ——— وہ نیک بخت یہ سوچ کر آئی تھی کہ کم از کم ان کے یہاں تو صفائی ہو جائے۔ ان ہی کی وجہ سے تو ہڑتال ہوئی ہے۔ بیچارے ہمارے لئے کتنی تکلیفیں اٹھاتے ہیں۔ کتنا برا ہوگا اگر ان کا گھر صاف نہ ہوا۔ بعد میں جھریا نے بتایا کہ فرید میاں اس بات پر ناراض ہوئے اور اس میں جھریا کا قصور بھی کیا تھا۔ سب مہتروں نے اسکو چھپ چھپا کر بھیجا تھا۔

گے مہترانیوں نے فرید سے کہا "کم از کم اپنے گھر تو صفائی کرا لی ہوتی۔"

"اپنے گھر ہی سے رہ گیا کہ ان کا پیٹ کاٹا جائے۔" دوبارہ میری ہمت نہ پڑی کہ کچھ کہتی۔ اماں کو جب پتہ چلا کہ یہ سب کارستانی میاں جی کی ہے، تو انہوں نے سر پہ اٹھا لیا۔

"بس یہی کام تو رہ گئے ہیں۔ ہم نے شریفوں کے یہ دستور نہ دیکھے۔ ماں باپ کی عزت پر منہ کا ٹیکہ لگا دیا ——— شرم نہیں آتی مہتروں میں جاتے ہوئے۔ میں تو وہی دن ختم پاتی، جب تو پیدا ہوا تھا، تیری جگہ اگر خدا پیٹ میں سانپ ڈال دیتا تو مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا۔" اماں دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

مجھے اماں پر ہنسی بھی آتی اور غصہ بھی۔

"جب تم ان چیزوں کو نہیں سمجھتیں، تو پھر کیوں اپنی ٹانگ اڑاتی ہو۔ غریبوں کا کام ہے۔ اس سے خدا رسول بھی خوش ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اماں کو قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر توبہ کرو وہ بھلا ایسے بہلاوے میں آنے والی تھیں ———

بقول اپنے: ———

"سترگھاٹ کا پانی پئے ہوں۔ لونڈیا مجھے چلاتی ہے یہ چونڈا دھوپ میں سفید نہیں کیا۔ خدا رسول کے خوش کرنے کے یہ طریقے ہیں۔ نہ نماز کے روزے کے۔ کبھی اپنے ہاتھ سے کسی غریب کو ایک پیسہ بھی نہ دیا ہوگا۔ باپ دادا ——— جنھوں نے پال پوس کر اتنا بڑا کیا۔ ان کے نام کو کبھی [illegible] اُٹھا۔ کریں گے بڑے ثواب کے کام۔ میری تو دن رات یہی دعا ہے کہ خدا اسکو عقل دے نہیں تو مجھے ہی ٹھکانے لگانے [illegible] ہوگی نہ جی جیے گا۔"

اب انکو کون سمجھائے میں تو تھک کر چپ ہوگئی۔

ہاں ——— وہ چندے والا قصہ تو رہ ہی گیا۔ ہم سب بہن بھائیوں نے مل کر چندہ جمع کیا اور طے کیا کہ فرید میاں کی سالگرہ کے دن ایک نفیس سوٹ بطور تحفہ پیش کریں گے۔ اس کے لئے جتنے منصوبے بنے ہمارا جی جانتا ہے۔ پر خدا جانے کس نے ان سے یہ بھید بتا دیا ——— ایک دن وہ آپ ہی آپ بولے۔

"کیوں زیب ——— میرے لئے تم نے سوٹ کے پیسے جمع کئے ہیں۔ میری بہنو کو اپنے بھائی کا کتنا خیال ہے۔ سچ ہے بہنوں کی محبت کتنی شفاف ہوتی ہے۔ موتی جیسی۔"

یہ سنکر زیب کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔

"اب بھی ہم نے [illegible] زیب [illegible]

[illegible] جیسے [illegible]

[illegible]

نہ تھی۔ اس میں نفس نہ تھا۔ وہ صرف ایک آہنی مشین کا پہیہ تھا جو دن رات اپنے محور پر گھومتا رہتا تھا۔ اس کا یہ ایثار آنے والی نسلیں نہیں بھول سکتیں ——————

—————— اس کی آزاد روح ہندستان کے جسم میں سرایت کر گئی۔

اگر اسی کا نام غداری ہے۔ تو پھر حب الوطنی کیا ہے؟

سورج غروب ہو چکا تھا۔ آسمان کی سرخی کھڑکی سے دکھائی دے رہی تھی اور وہ تصویر تنی بے جان ہوتے ہوئے بھی آسمان کی سرخی پر نظر کیے ہوئے تھی۔ آنسو کا قطرہ بھی سرخ ہو گیا تھا اور پھر مجھے یہ محسوس ہوا جیسے [illegible] ہنس رہے ہوں۔ سرخ کپڑے پہنے ہوئے [illegible] خون میں ڈوبے ہوئے کپڑے، دھرتی سرخ ہے، آکاش سرخ ہے۔ [illegible] جو دور آسمان کی بلندیوں پر لہرا رہا ہے۔

بھو بازار

بھی کوئی پتہ نہ تھا۔ رشمی ـــــ جس کا تصور رمیش کی زندگی کا سہانا سپنا تھا۔
یہ دو برس اس نے نہ جانے کن الجھنوں میں کاٹے۔ صرف اسی خواہش پر کہ ایک
دن وہ رشمی کو اپنا لے گا۔ پر جب وہ کلکتہ پہونچا تو اس نے دیکھا کہ وہاں کی
زندگی ہی درہم برہم ہو چکی تھی۔ اس کے دماغ میں باپ کے الفاظ رینگنے لگے۔
"اگر گورنمنٹ غلہ پر کنٹرول کرے گی تو ہم اناج کی کوٹھریوں کے دروازے بند
کردیں گے۔ اور جب تک کنٹرول نہیں اٹھے گا تالے نہیں کھلیں گے۔ مگر بنگال
میں قحط پڑ تو اس کے ذہن میں بھی نہ آسکتا تھا اور پھر کچھ دن ہی بعد اس
نے سنا کہ سارے بنگال پر قحط چھا گیا۔ لاکھوں انسان موت کی ابدی نیند
سوگئے پھر اس کے گھر سے یہی اطلاع آتی رہی" ہم سب خیریت سے ہیں چاول
کی کمی نہیں" رمیش کو اخبار والوں پر غصہ آتا۔ اگر ایسی خبریں نہ چھاپیں تو
ان کا اخبار کیسے چھپے؟

چند ہی دنوں میں بنگال کی بھوک کی خبر سارے ہندستان میں آگ کی طرح
پھیل گئی۔ اخباروں کے کالم کے کالم بھوک اور بیماریوں سے جھلس کر رہ گئے ـــــ
کہیں اس کی رشمی ان لمحوں میں نہ لپٹ گئی ہو۔ وہ اس سے زیادہ نہ سوچ سکا۔
دہشت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ چاول کہاں اڑ گیا۔ اس کے دیس کی مٹی کو
بھی ہاتھ لگاؤ تو چاول ملتا ہے بھارت کی دھرتی تو سدا سہاگن ہے۔ بارہ مہینے
سونا اگلتی ہے تو پھر یہ قحط یہ بھوک۔ وہ کچھ ایسا محسوس کرنے لگا جیسے چاول کے
بورے کے بورے دھرتی میں دھنستے چلے جا رہے ہوں۔ ماتا اگل دے ان دانوں
کو کیا تجھے اپنے بیٹوں کا خیال نہیں۔ پہلے چاول کھا گئی اور اب اپنے ہی سپوتوں۔

کو نگل رہی ہے۔ اگلے لوگ کہتے تھے کہ ماں ڈائن ہو گی تو کیا اپنے ہی بیٹوں
کو کھائے گی، تو نے کہاوت کی لاج بھی نہ رکھی۔

رمیش کے ہاتھ میں اخبار تھا اور دماغ میں خیالات کا دھارا وہ سماج کے
اس کاغذی پیرہن کو چیر کر اس کے عریاں جسم کو حقارت سے گھور رہا تھا۔ پھر اُس
کو فضا میں رشمی کی شکل اُبھرتی نظر آئی۔ جیسے وہ بھوکی تھی۔ پیٹ کمر سے لگ
گیا ہے۔ گال اندر کو دھنس گئے ہیں۔ ہونٹ خشک اور آنکھیں جیسے اُبل پڑتی
ہیں۔ بنگالی آنکھیں جیسے کنول نے پٹ کھول دیئے ہوں ـــــ جس میں دھارا
نے جنم لیا۔ بھوکی دھارا وہ کہہ رہی تھی۔

"میرے گوپی تمہاری دھارا کا یہ حال ہے۔ وہ روز کہتے کہتے زرد ہو گئی اور
چند گھنٹے کی بات ہے پھر دھرتی بھی [illegible] کی طرح اس کو بھی نگل جائے گی۔ مگر تم
چاہو تو اس کو بچا سکتے ہو۔ تم سب سے بنگال کی دھاراؤں کو بچا سکتے ہو تم سب
باپ کے گود [illegible] میں چھوڑ کر ہی [illegible] سے پردہ۔ رکشش ہو گیا"
"رکشش"

"معاف کرنا مجھے تمہارے پتے کے لیے الفاظ نہ کہنے چاہئیں تھے۔"

رمیش گھبرا گیا کیونکہ کے پتے نے آج کے تحت انسانوں کا بھی بیوپار شروع کر دیا
ہے۔ زندگی اور موت کا بیوپار ــــــ انسانیت کے مستقبل کا بیوپار ــــــ
چاندی کے چند ٹکڑوں کے لیے جو صرف تجوریوں تک بھٹ جا سکتے ہیں اس نے محسوس
کیا کہ جیسے کتنی ہی رشمی جیسی لڑکیاں [illegible] اس کو گھیرے ہوئے
ہیں "ہم بھوکے ہیں ہمیں بچاؤ ان کو [illegible]

طرح منڈلانے لگیں۔ اگر اس کی یہی حالت رہی تو وہ ضرور پاگل ہو جائیگا ——
وہ گھبرا کر تیزی سے گھر سے باہر نکل جاتا مگر وہاں بھی ننگے بھوکے جسم اس کا پیچھا نہ
چھوڑتے —— بچے خوفناک بچے انسانوں کے نہیں بھوکوں کے بچے سڑک پر پڑے
ہوئے پیٹ غبارے کی طرح پھولے ہوئے کس قدر ڈر لگتا ہے ان کے پیٹ کو دیکھکر
معلوم نہیں یہ بچے سوکھی گردن پر سر کے اتنے بھاری بوجھ کو کس طرح اُٹھائے پھرتے
ہیں —— بنگال کا مستقبل۔ آنے والے کلچر کے نمائندے اور پھر فضا میں ریشمی
کی شکل اُبھرتی دکھائی دی۔ اس نے شہر کا چپہ چپہ چھان مارا پر ریشمی کا پتہ نہ
چل سکا اور چلتا بھی کہاں سے وہ سماج کے بلند میناروں پر اپنی پستی کا مظاہرہ
کر رہی تھی۔ وہ سب کچھ لٹا چکی تھی۔ رنگ، روپ، جوانی اور اب کھانکر میں
سانس کے انجن کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ پہلے چند پرزے کھڑکھڑاتے ہیں اور پھر ایک
پرزہ خاموش ہو جاتا ہے جیسے کسی نے روح کھینچ لی ہو —— ایک شور ایک گھڑگھڑاہٹ
اور پھر بے جان لاش۔ جس کا کوئی مصرف نہیں۔ اور پھر چند روز بعد ایک نئی مشین
آجاتی ہے۔ پھر وہی کاروبار وہی چاندی کے چمکدار سکے کھن —— کھن ——
کھن جن سے دیگر انسان اور مشین دونوں رقص کرتے ہیں۔

ریشمی بھی تو ایک مشین ہی تھی جو اب قریب قریب زنگ آلود ہو چکی تھی جس کے
پرزے گھس گھس کر کھڑکھڑا رہے تھے۔ کون جانے کس وقت خاموش ہو جائیں۔ کچھ بھی تو
باقی نہ رہا تھا۔ اٹھارہ سال کی بڑھیا جس نے چند ہی ماہ میں زندگی کی ساری منزلیں
طے کر لی تھیں۔ وہ کیچڑ میں اس کیڑے کی مانند رینگ رہی تھی جسے پانی کا ایک ریلا بہتے بہتے
اُلٹا کر دے اور تڑپتی رہی وہ۔ بہتا چلا جائے اور پھر سیدھا ہو کر اسی طرح بہنے لگے۔

رشمی کا جیون یوں ہی ختم ہو گیا آشائیں مٹ گئیں۔ بچپن اور جوانی کا خواب چکنا چور ہو گیا۔ رشمی اٹھارہ سال کے بن میں کتنی تجربہ کار ہو چکی تھی۔ بھارت کی بیٹی نے اتنی کم عمری میں وہ کچھ جان لیا تھا جو عام انسان پورا جیون بتانے کے بعد بھی نہیں جانتا ——— مبارک ہو اے ماتا تو نے ایسی سمجھ دار اور تجربہ کار بیٹیوں کو جنم دیا ——— تیرے قصیدے آنے والی نسلیں تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھیں گی رشمی جیسی لڑکیاں بنگال کے اندھیارے میں ہر جگہ ملیں گی ان کے لئے چراغ لیکر نکلنے کی ضرورت نہیں۔ رشمی کا بچپن ہنستا کھیلتا بیت گیا ——— جوانی آئی ——— قہقہے لگاتی ہوئی ——— اور آج ان قہقہوں کی آواز دور بہت دور پہاڑوں سے ٹکرا کر واپس آ رہی ہے۔ جیسے وہ اس کے جیون پر ہنس رہی ہو۔ جب وہ جوان ہوئی تو پرکاش کے بدلے اس نے رات کے اندھیارے میں اس کو وہ دکھائی دئیے دھندلی راہوں میں رمیش نے اس کو سہارا دیا تھا۔ وہ ایک اجنبی اس کی زندگی میں داخل ہوا اور جلد اس کا اپنا ہو گیا۔

"رمیش! تم ان ٹمٹماتے ہوئے تاروں کی طرح تھوڑی دیر تک چمک کر غائب تو نہ ہو جاؤ گے؟"

"پگلی ——— تو میرے جیون کی کرن ہے۔"

پھر رمیش اس کی ریشمی زلفوں سے کھیلنے لگا [illegible] ہمیشہ اسی طرح ان گھنیری زلفوں سے کھیلے۔ وہ رشمی کی نظر میں عورت کی عصمت زندگی کی سب سے بڑی قربانی ہے اور اس کا احترام اس سے بھی بڑی ——— کیونکہ وہ جسم اور روح کی نہ جانے کتنی تہوں سے ابھر کر زبان کی نوک تک آتا ہے۔

رشی نے اس کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

بوڑھیا رشمی چونک پڑی۔ اس نے اپنے نحیف جسم پر مضبوط بازوؤں کی گرفت کو محسوس کیا۔

نوجوان رشمی ——— اس کا جی چاہا ایسا قہقہہ لگائے جو فضا کو چیرتا ہوا آسمان کی بلندی پر جا لگائے۔

نوجوان رشمی نا سمجھ تھی جس نے دھوکا کھایا۔ تجربہ کار رشمی پاگل ہے جو اب گذری ہوئی باتوں پر پچھتاتی ہے ——— "نوجوان"۔ اس نے آہستہ آہستہ اُسے دہرایا اور اس آواز میں اس نے نفرت کے تمام جذبہ کو بھر دیا۔ وہ پھر اپنے حال کو بھولنے کے لئے آتے ہوئے طوفان سے آنکھیں بند کرتے ماضی کے خواب دیکھنے لگی۔

"رشی! اس سنسار میں سدا سے بڑے چھوٹے کا فرق چلا آیا ہے۔"

"رشمی ——— رشی انسان ہے۔"

"راکھشش ——— نہیں۔"

بوڑھی رشمی چونک پڑی ——— راکھشش ——— سارا بنگال راکھشش ہو گیا ہے یہاں اب انسان نظر نہیں آتے ——— دیویاں نظر نہیں آتیں ——— رات کی رانیاں دکھائی دیتی ہیں ——— جو آسمان کے تاروں سے بھی اپنا دل نہیں بہلا سکتیں۔ رشی اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ اس کو وہ جتنا بھولنے کی کوشش کرتی تھی۔ اتنا ہی یاد آتا تھا ——— ایک معمولی سا واقعہ۔ پر آج دو برس بیت گئے۔ اس دوران میں نہ جانے کتنے انقلاب آئے جن سے دنیا کے نقشے ہی بدل گئے فاشزم کا خاتمہ ہو گیا۔ دنیا امن و امان کی طرف دوڑ رہی ہے مگر ہندستان!

"ایک زمانہ تھا جب غلاموں کے بیچنے کا رواج تھا" ماتھر نے بغیر سوچے سمجھے کہا اس لئے کہ حقیقتیں اتنی واضح تھیں کہ ان کے سوچنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔

"تو اب وہ رواج کون سا ٹوٹ گیا" حسن نے جواب دیا کہ "ہاں میں بھی تو یہی کہہ رہا تھا ـــــ لیکن قانون نے غلاموں کا بیچنا جرم قرار دیا اور سرمایہ داری کی یہ تجارت پٹ پڑ گئی پر آج زمانہ آگے چلنے کے بجائے پیچھے جا رہا ہے آج پھر ہندستان نے بڑے طمطراق سے اپنی بہو بیٹیوں کی سربازار تجارت شروع کر دی"

"ہاں بھائی ـــــ اپنے گھروں کی لاج ہم نے آج سربازار لاکر سجا دی۔ آج کوئی قانون اس کو روکنے والا نہیں ـــــ شاید اس بازار کو اب کبھی زوال نہ آئے گا۔" ماتھر نے سگرٹ سلگاتے ہوئے جملہ ختم کیا۔

"جب تک ہمارے گوداموں میں چاول ہے۔ ہماری جیبوں میں چاندی ہے ہم اپنی ماؤں اور بہنوں کو ہر روز اسی طرح بازاروں میں سجائیں گے۔ ان کے جسموں کی تجارت کریں گے۔" رشی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ماتھر اور حسن اسکا منہ تکنے لگے۔

"کیا دیکھتے ہو میرے دوست"

وہ ہنسا "تم زندہ ہو اور زندگی کے لئے ترستے ہو۔ تم میں روح نہیں۔ تمھارے احساس کی قوت مٹ گئی۔ تم لفاظی کرتے ہو۔ اپنی روح کو بیدار کرو۔ جو موت کی نیند سو گئی ہے۔ جاؤ یورپ کو تیسری جنگ عظیم سے بچاؤ۔ ایشیا کو آزادی کے سپنے دکھاؤ۔ خود غلام رہو اور غلاموں کی تجارت کرو۔"

رشی دانت پیس پیس کر بول رہا تھا۔ جیسے وہ اس نظام کی ہڈیاں چبا رہا ہو یکایک بجلی گل ہو گئی۔

"اس اندھیرے میں تم انتظار کر رہے ہو، میرے دوست آنکھیں ہوتے ہوئے بھی تم اندھے ہو۔ اندھیرے نے راہ کی دشواریوں کو ڈھانپ لیا۔ آگے بڑھو۔ سونے کا وقت بیت چکا۔ مشعل اپنے ہاتھ میں لو وقت چلا چلا کر بلا رہا ہے۔ کان کھولو۔ خضر کا کام سکندر کی رہنمائی کرنا ہے۔ تمھاری نہیں۔"

ماتھر اور حسن خاموش تھے۔ وہ بولتا ہی چلا گیا۔ آج رشی بہت زیادہ پریشان معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے اس کا دماغ خراب ہو گیا ہو۔ پھر ماتھر نے ادھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ رشی خاموش ہو گیا۔ وہ پہلے کی طرح سگرٹ کے کش لگانے لگا آج سے پہلے وہ کبھی رنڈیوں کے چکلے بھی نہیں گیا تھا پر آج نہ جانے کیوں وہ ماتھر کے کہنے سے راضی ہو گیا۔ شاید وہ گناہ میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کو تحلیل کر دینا چاہتا تھا۔

"دوست اس دیوانگی کو چھوڑو۔ جب تک زندہ رہو۔ کھاؤ، پیو۔ لطف اٹھاؤ۔ اسی کا نام زندگی ہے ——— وہ دیکھو سامنے جو بالا خانہ ہے نا ——— ایک لڑکی رہتی ہے۔ کوئی پندرہ بیس سے عمر زیادہ نہ ہوگی۔ پر جنسی جاذبیت تو نام کو نہیں بات کرتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے فلسفہ کی کتاب کھول دی ہے۔ خشک اور بے ربط۔ جسم میں حرارت بھی تو نہیں بدن میں نہ جانے خون ہے یا پانی۔"

"آؤ ——— ذرا آج ادھر ہی چلیں" حسن نے جواب دیا۔

"وہاں جا کر کیا کریں گے" ماتھر بول اٹھا "ہمیں عورت چاہئے عورت ——— فلسفہ کی کتاب نہیں۔ کتابیں تو لائبریریوں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بہت

بھری پڑی ہیں۔ انھیں کتابوں نے رمیش جیسوں کے دماغ خراب کر دیے ہیں۔ ہماری بھوک کے لیے جسم کی ضرورت ہے۔ تندرست جسم۔ بھولے بھولے سیب جیسے گورے گال۔ اُبھری اُبھری چھاتیاں۔ یہاں ہم جسم خریدنے آتے ہیں کتابیں نہیں۔"

"رمیش ——— رمیش ——— واہ بیٹا سو رہے ہو۔ رمیش تم اگر اس لڑکی کو دیکھو تو مجھے یقین ہے کہ تمھاری اس روتی صورت پر بھی ہنسی دوڑ جائے گی۔"

"بھائی حسن۔ کسی زمانہ میں ضرور پٹاخہ رہی ہوگی۔ پر اب تو حسن کے آثار قدیمہ بھی مٹتے جا رہے ہیں مگر دوست اُس کی باتوں میں عجیب جادو ہے۔ جو دماغ کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔"

حسن، خیر محمد جب رشیدے کے کوٹھے کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا شاید وہ رمیش کو اس عجیب و غریب ہستی سے متعارف کرانا چاہتا تھا۔ سیڑھیوں پر ہر طرف اندھیرا تھا۔ تینوں اندازاً قدم جمائے چڑھتے رہے۔

"کیا آپ میرے پاس آئے ہیں؟" ——— ایک عورت بھی پرانی گندی ساڑی میں بیٹھی ہوئی سامنے کھڑی ہوئی۔ اُس کے قدم لڑکھڑاتے رہے۔

"جی ہاں ——— خیر محمد نے جواب دیا۔ رمیش کی نظریں برابر زمین پر گڑی رہیں۔ اُس کی آنکھوں میں شاید اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ وہ اوپر دیکھ سکے۔

"آپ کچھ اُداس ہیں سیٹھ جی!" لڑکی نے بے تکلفی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"سیٹھ جی!" رمیش نے حیرت سے سر کھجاتے ہوئے الفاظ دہرائے، "اور نہیں تو کیا ——— تمھارے یہاں بھوکے کنگال آئیں گے۔ ہم یہاں سیٹھوں کا دل بہلانے کے لیے گدھ تیلیوں کی طرح بیٹھے ہیں ——— ہم میں درد نہیں

ہم صرف جسم ہیں ــــ ننگے بھوکے جسم ــــ اور سیٹھ جی آپ نے غلطی کی جو یہاں آئے میرے پاس تو جو کچھ تھا وہ سب لٹ چکا ہے ان سماج کے ٹھیکہ داروں نے خون کا آخری قطرہ تک چوس لیا۔ ہڈیوں سے گوشت کا آخری ریزہ تک کھرچ کر نگل لیا۔ یہاں آپ کو کیا ملے گا۔ چند تاریک بیماریاں جو پشت پشت آپ کی نسلوں میں یادگار رہیں گی۔" وہ بولتی جا رہی تھی جیسے پانی کا بند ٹوٹ گیا ہو۔

رمیش کو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی ہتھوڑے سے اس کے دماغ پر ضربیں لگا رہا ہو۔ وہ دیوانوں کی طرح بڑبڑاتا ہوا بھاگا۔ جیسے کھوئی ہوئی چیز پا کر دوبارہ کھو جائے ــــ اور آکاش کے تارے دھرتی کی سیاہی میں اپنی روشنی کھونے لگے۔

تاش کا گھر

جوانی آئی تو کیا لائی ——— ایک سپاٹ زندگی جس میں کچھ بھی تو نہیں۔ اس میں کبھی بھی مدوجزر نہیں آیا۔ پانی کی یہ لہریں جو ہوا سے اُٹھتی ہوئی ساحل سے ٹکراتی ہیں اُن میں بھی وہی ہم آہنگی ہوتی ہے۔ ذرا بھی تو فرق نہیں۔ اس کا ماضی اور حال ایک جیسا تھا۔ ہمیشہ ہی سے گُپ چُپ بیٹھے ہوئے سوچنے کی عادت ——— بے معنی باتیں۔ جو اپنی مہملیت کے باوجود زندگی پر اثر ڈالتی ہیں ——— اختر کی دوستی، اس کی کھوکھلی شان و شوکت جو تاش کے پتّوں پر کھڑی ہے۔ ذرا اشارہ لگا اور "اڑا اڑا دھم" ——— تعلقات بھی تو دیکھو، کوئی نواب کا بیٹا ہے تو کوئی کلکٹر کا بھتیجا۔ ڈیڑھ پٹی کے نیچے تو پٹّھا کسی سے بات ہی نہیں کرتا ——— اور ہر دم کالج کی چھوکریوں کے قصّے ——— کالج کی لڑکیاں، خدا جانے یہ کچھ پڑھتی لکھتی بھی ہیں یا ہر وقت رومان ہی لڑاتی ہیں ——— اور وہ رومال والا قصّہ سیٹ پر اگر کسی لڑکی کا رومال رہ گیا تھا تو کیا ہوا؟ ایسی کون سی عجیب بات تھی۔ بھول گئی ہوگی بیچاری یا اتفاقاً گر گیا ہوگا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ مگر نہیں۔ ——— وہ تو جان کر چھوڑ گئی تھی کہ جناب اختر صاحب تشریف رکھیں گے اور اُٹھائیں گے۔ اس حماقت پر بھلا کس کو ہنسی نہ آئے گی۔ کالج میں سینکڑوں لڑکے پڑھتے ہیں۔ یہی تو ایک گویا شہزادے تسلیم رہ گئے ہیں جن پہ ساری لڑکیاں پھڑکی ہو رہی ہیں۔ ارے احمقو! ——— اگر لڑکیاں تمہاری طرح "گاؤدی" ہوتیں تو آج ہر طرف "لیلائیں" ہی "لیلائیں" نظر آتیں اور پھر میاں مجنوں اپنی لیلی کو بھول کر گھر کی کسی لیلی کی تلاش میں بادہ پیمائی کرتے نظر آتے ———

"بگو آپا ——— ذری چائے تو بنا دے۔ لپک کے۔"

"پھر وہی بدتمیزی ـــــ آج بنوالے تو تب بھی دیکھوں۔"

"اچھا ـــــ نہیں نہیں۔ میری نکہت آپا، ناراض ہوگئی۔ اب سے کبھی نہیں کہوں گا، لو کان پکڑتا ہوں۔"

"کالج میں کیا پہونچ گیا ہے۔ بڑی باتیں بنانی آگئی ہیں۔"

"مان جاؤ نا ـــــ میری آپا، اب نہیں کہونگا۔" اختر نے خوشامد کی۔

"گھر چائے تو ہے ہی نہیں اور ابھی ابا جان کی تنخواہ ملنے میں کئی دن ہیں۔ سات تاریخ سے ادھر تو کبھی ملتی ہی نہیں۔"

"چائے ختم ہوگئی ـــــ اچھا میں ابھی بنئے کے یہاں سے چھوٹا پیکٹ منگائے دیتا ہوں۔ دیکھو ذرا جلدی بنا دینا۔ عزت کا سوال ہے آپا ـــــ میری نکہت آپا ـــــ اچھا میں نہیں ـــــ"

میرے چہرے پر ایک رنگ آیا اور فوراً ہی غائب ہوگیا۔ اب اگر چپ رہے ہی پر عزت کا دم دھرا رہے تو پھر یوں نہیں بنے گی۔ ضرور بنے گی میں خاموش ہوگئی۔ کہیں ابا میاں کو معلوم ہو جائے تو پتہ چلے ـ کسی دن ابا نے اندر کی [illegible] مشغول تھی اس پر پیسے دے [illegible]۔ سارا گھر سر پر اٹھا لیا تھا۔ ابا میاں کا غصہ ٹھنڈا پڑنے [illegible] جیسے آج بھی [illegible] اور ہم سب ننھے پرندوں کی مانند ادھر ادھر دبکے پھر رہے تھے۔

"میں کہتی ہوں کبھی تو [illegible] خاندان آن پر بٹہ لگانے کے لئے تم گھر میں آئی ہو۔ باپ دادا کی عزت مٹی میں ملانے کے لئے۔"

"عزت" ___ بی بی ___ کتنا سستا لفظ ہے۔ امی سہم گئیں۔ ہاتھ پاؤں بے جان ہو گئے۔ میں نے بمشکل ان کو اپنے بازو کا سہارا دیا۔ کھلی ہوئی خاندانی عزت۔ ایک نہ ایک روز یہ عزت امی غریب کی جان لے کر ہی رہے گی ڈاکٹر نے کتنی دفعہ کہا ہے کہ ان کو ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کرو۔ ان کے دل پر کسی بات کا اثر مت ہونے دو۔ ورنہ زندگی سے ہاتھ دھونا پڑیگا۔ میرے خیالات پلٹے کھانے لگے۔

"ارے کہاں گئیں۔ نکہت آپا؟"

میں چونک پڑی۔ یہ تو شہزادی بی آگئیں۔ یک نہ شد دو شد۔

"آپا ___ یہ دیکھو ہماری دوست آئی ہیں۔ ان سے ملو۔ آپ ہیں مس ثمینہ سکنڈ ایئر کی طالب علم ___ آپ مس تخمیم فورتھ ایئر۔ اور آپ مس صالحہ فرسٹ ایئر ___ "فول" اور ایک بلند قہقہہ جیسے کمرے کی چھت گر رہی ہو۔ میں چونک پڑی۔ بس شہزادی کی اس عادت پر تو مجھے انتہائی کوفت ہوتی ہے۔ بغیر کوشش دئے ہر کسی سے تعارف کرا دیتی ہیں۔ اسی روز جب اختر کے کمرے میں لڑکے بیٹھے ہوئے تھے اور میں کھڑی سن رہی تھی کہ کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ حالانکہ کوئی خاص بات نہ تھی وہی لیلیٰ مجنوں والے فسانے جو روز ہی تو دُہرائے جاتے ہیں ___ ۔ اور جب کہانی رومان کے موڑ پر تھی۔ شام کی دھیمی دھیمی روشنی رات کے تاروں میں جذب ہو رہی تھی۔ جیسے کوئی دُور کہیں سہاگ گا رہا ہو۔ شہزادی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "دیکھو تمہاری ملاقات نئے نئے آدمیوں سے کراؤں"

مجھے غصہ آیا ___ بھلی ملاقات ہوئی۔ روزانہ ایک نہ ایک جدید محترم سے

چلی آ رہی ہیں۔

کمرے میں قدم رکھتے ہی ایک کہرام مچا دیا۔ لڑکوں نے بھی کیا کہا ہوگا کہ یہ ہماری باتیں سُن رہی ہیں۔

"کیا سوتے سے اٹھا دیا" میں نے چلا کر کہا۔ تاکہ پاس والے کمرے تک آواز پہنچ جائے۔

"سو رہی تھیں یا پڑی آنکھیں پٹ پٹا رہی تھیں۔ بولنے بھی خوب بنتی ہو"

مجھ میں جواب دینے کی تاب نہ تھی۔ میں خاموشی سے اٹھ کر دالان تک چلی گئی تو میرے سامنے شہزادی بی کے "تین بڑے" (BIG-THREE) نمایندے کھڑے تھے جو نہ جانے کس کے مستقبل کا فیصلہ کرنے آئے تھے۔ میری زبان سے باوجود کوشش کے ایک حرف بھی نہ نکل سکا۔

اور وہ ـــــ دھڑ دھڑ کرتا دل۔ وہ تین مجسّمے۔ وہ شہزادی بن کر ... کرتی ہوئی لیلیٰ مجنوں والے کمرے تک پہنچ گئیں۔ جہاں تخت پر شاہ ... شیشے کھنکتے ہیں، آنچل سرکتے ہیں، کلیاں چٹکتی ہیں اور میں خاموش کھڑی ہوئی جیسے کسی کے حکم کا انتظار کر رہی ہوں۔

"کیسی کھڑی ہو۔ تم بھی بیٹھ جاؤ نا" تین بڑوں میں سے ایک نے کہا جن کی ساری کے پلو کا سرا انہوں نے ... رکھا تھا۔

"مجھے تو چائے تیار کرنی ہے۔ آخر کے دوست بیٹھے ہیں نا"

"تم بیٹھو ـــ نوکر ہے کے ذرا ... چائے تیار کر دے گا۔ تمہیں کیا فکر پڑی رہتی ہے۔ مجھے معلوم ہے یہ عادت نہ ... ہے کہ نوکروں کے ہوتے ہوئے ہر کام

خود ہی کرنے کو تیار رہتی ہو۔ اسی سے تو ان کی عادت بگڑتی ہے اور دن بہ دن آرام طلب ہوتے جا رہے ہیں۔" شہزادی بولیں۔

میں خاموش رہی چلو ان کی ہی بات اونچی ہونے دو۔ نرے نوکر ہی تو چھٹے ہیں۔ جیسے آپ سچ مچ کی شہزادی ہیں۔ نہ جانے کچھ ہوتیں تو شاید زمین پہ قدم نہ ٹکتا۔ گھر تیں نے دے کر ایک باپ دادا کی کمائی ہوئی عزت ہی تو رہ گئی ہے۔ سو اُس کا اب اللہ ہی بیلی ہے۔

اختر نے کمرے سے آواز لگائی "بڑی بی ذرا چائے جلدی لانا اور اگر شکر ہو تو حلوا بھی ——"

میں دل ہی دل میں ہنسی اور پھر میرے کان برابر والے کمرے کیطرف لگ گئے۔

"الف —— میاں جب سے یہ کنٹرول ہوا ہے اچھی اچھی چیزوں کو تو زبان ترس گئی۔ بھلا بتاؤ راشن کارڈ پر تو شکر ملتی ہے اور اس پر بھی پابندی"

"سچ ہے گھر تیں نہ تج نہیں اور ماں پیسے گئی" میں بغیر کچھ سوچے سمجھے باورچی خانے کی طرف ہولی —— یوتھوں کے کاگ فضا میں اُچھلنے لگے، بادلوں کے ٹکڑے چاند سے سرکنے لگے۔ چاند جتنا صاف ہوتا جاتا تھا دھبّے اور نمایاں ہوتے جا رہے تھے۔ مگر انسانیت کا مستقبل —— تاریک —— نہیں نہیں۔ چودھویں کے چاند کی مانند روشن ہے۔

"ارے —— وہ اپنا نیا ڈنلاسکن جمپر تو دکھا"

"وہ تو دھوبن لے گیا ہے" میں شہزادی کی آواز سنکر چونک پڑی۔ پھر برابر والے کمرے کی آوازیں کچھ اس طرح ہنگامہ پرور ہوئیں کہ شہزادی کی سہیلیوں کی

"بھیا تجھے کسی نے مارا ہے؟" میں نے پیار سے پوچھا۔

"نہیں تو"۔ اختر نے قمیص کے دامن سے آنکھیں اور ناک پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

"ناہیں۔ مارا"۔ اُسکے ساتھی نے کہا۔ "ملوا نے تو مارا ہے"۔

"کیوں رے ملوا۔ میرے بھیا کو کیوں مارا۔ اور ملوا سہم گیا۔ اُس کے جسم کا رُواں رُواں کھڑا ہو گیا"۔ اُس کی نظریں دروازہ کے پردے سے ہٹ کر دور فضا میں جیسے کسی چیز کو تلاش کرنے لگیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ ایک دم ہی تو چیخ اُٹھے گا۔ اختر کی گھبراہٹ ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے سامنے انسانیت کے "بڑے تین" نہیں "چھوٹے تین" نمائندے کھڑے تھے۔

"کہاں مارا۔ یہ جھوٹا ہے۔ میں تو گر گیا تھا"۔ اور اختر ملوا کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ تب کہیں جا کر ملوا کے جان میں جان آئی۔

انسانیت کا مستقبل بہت روشن ہے اور "تین چھوٹے" گویا بڑے ہوتے ہوتے "تین بڑوں" سے بھی بڑھ گئے ــــ جیسے چاند کا دھبا روشن ہو گیا۔ سیاہی دور ہو گئی اور اب اُس کی روشنی ہر جگہ یکساں طور پر پڑے گی۔ دوسرے لمحے اختر کا ہاتھ ملوا کے گلے میں پڑ گیا۔

"اچھا چل" بہت پیار ہو چکا۔ منہ ہاتھ دھو کے کھانا تو کھا لے"۔

"مجھے بھوک نہیں ــــ چل رے ملوا گلی ڈنڈا کھیلیں"۔

"کیوں بھوک نہیں"۔ میں نے اس کو جانے سے روک کر پوچھا۔

"اچھی آپا ــــ ایک بات بتاؤں۔ بگڑو گی تو نہیں"۔

کیرم بورڈ کے مہرے

نوشابہ دوا پیستی جارہی تھی۔ بالکل مشین کی طرح، اس کے ہاتھ ایک ہی انداز سے سل پر چل رہے تھے۔ آج نہ جانے کیوں اس کا جی چاہتا تھا کہ کوئی شعر گنگنائے لیکن شاید ابھی ہمارا شاعر اس بلندی پر نہیں پہونچا جہاں وہ فرداً فرداً ہر شخص کے احساسات کی ترجمانی کرے۔ اس کو اپنی شاعری کا تو احساس نہ تھا اور وہ ان شاعروں کو موردِ الزام ٹھہرا رہی تھی جنہوں نے دیوان کے دیوان گوڑ ڈالے، دسوں دیوان تو اس نے بھی پڑھ ڈالے تھے پر اپنے حسب حال ایک شعر بھی اس کی نظر سے نہ گذرا اور ان نئے شاعروں کا تو ذکر ہی فضول ہے جنکے پاس سوائے "بھوک" یا --- پھر "عورت" کے دوسرا موضوع ہی نہیں --- عجیب لوگ ہیں یہ بھی ---

چند دنوں سے وہ اپنے سیاسی دماغ کو خیرباد کہہ چکی تھی جو ہمہ وقت دنیا بھر کے بکھیڑوں میں پھنسا رہتا تھا۔ چنانچہ کہاں تو ہر وقت اخبارات میں سیاسی ادب کی چھان بین ــــ کہاں اب ہر وقت مومن۔ ناسخ۔ آتش کے اشعار زبان پر جیسے وہی زندگی کے حقیقی ترجمان ہیں ــــ وہ پھر اپنے خیالات میں کھوگئی ــــ سیاست ــــ ہونھ اس نے ہونٹ بچکائے ــــ ایک وقتی حرارت ہے، کیا دھرا ہے ان چیزوں میں۔ زندگی کی مستقل قدروں میں انکا شمار کبھی نہیں ہوسکتا آج وہ اپنی اس عمارت کو ڈھانے پر تلی ہوئی تھی جسکی بنیادوں کو اُس نے اپنے خون جگر سے بنایا تھا جہاں تک سیاست کا تعلق ہے کالج کی لڑکیوں میں دور دور نوشابہ سے بہتر کوئی نہ تھی۔ اسکی تقریریں ہمیشہ ہی اوّل درجہ کی مانی جاتی تھیں۔ کیونکہ اس کے پاس سیاست کا ایک ایسا نظریہ تھا جس پر وہ مضبوطی سے قدم جمائے رکھتی تھی ــــ اُف ــــ پر آج رومان کی ایک ہلکی سی لپٹ نے اسکو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ سچ مچ لپک ہی تو تھی جس نے اس کی ذرات تک میں چنگاریاں سی بھر دیں ــــ اور اب وہ چنگاریاں اس کے رونئیں رونئیں سے پھوٹ رہی تھیں۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ رومان ہی زندگی کی ابدی حقیقت ہے، جس کو کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتا۔ اسکی حقیقت سیاسی نظریوں کی طرح تبدیل ہونے والی نہیں۔ اس کا ہاتھ بدستور قلم پر چل رہا تھا اور خیالات ذہن میں اُلجھ رہے تھے۔ یکایک اُمّی کی گرجدار آواز نے اُلکو منتشر کر دیا۔ جب حرکت ہی ہر چیز ہو، ڈوبے مرے " "سیر ہیگر" کی ذرا سی جنبش سے بات کی بات میں منتشر ہو جاتے ہیں۔

یہ امی بھی اچھی خاصی مصیبت ہیں۔ جب چلاتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے بجلی تڑخ رہی ہے میرے تو کان اڑ جاتے ہیں۔

"کیا ہے —— امی؟" اس نے جھنجھلا کر پوچھا۔ لیکن پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کے الفاظ کا زور زیادہ بڑھ گیا۔ وہ اپنی حدود سے تجاوز کر گئے۔ اسی لئے فوراً ہی اسکی تلافی کے لیے اس نے بڑے میٹھے اور نرم لہجہ میں کہا ——

"بس ذرا سا دو ایک بات اور کوئی کام ہے امی؟"

نوشابہ باوجود کوشش کے اس تلخی کو نہ مٹا سکی جو اس کے ذہن میں پہلے سے موجود تھی۔

نوشو! یہ تو نے مفت کی مصیبت مول لے لی [illegible] پیسے کر —— [illegible]
ہے کہاں تک پیسے گی —— بات بھی دور ہونے لگے ہوں گے"

"جہاں تنہا بیٹھے وہاں تھوڑا دیکھی —— اب [illegible] یہ [illegible]
پردیسی ہیں۔ اب [illegible] تو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں [illegible]
بھٹکتے ہیں" وہ [illegible] کہہ رہی تھی۔ سچ پوچھو تو [illegible]
جس سے وہ امی کے جذبات کو مجروح کر دیتی تھی اور پھر [illegible]
کی کس مپرسی کی زندگی پر افسوس سا ہونے لگتا —— اپنے گھر ہوتے تو [illegible]
ماں باپ ان کے لیے کیا کچھ نہ کرتے۔ لیکن جب [illegible] امی کو [illegible]
پر غصہ آ رہا تھا۔ خود سے کچھ بھی تو نہ [illegible]
اپنے کام میں لگ گئی۔ [illegible] جیسے [illegible]
ہے —— [illegible] بات نہ تھی کیونکہ یہ تو [illegible]

پھر بھی اسکا ذہن جملہ پورا نہ کر سکا اور نہ وہ اس خیال کو ہی دماغ سے نکال سکی، اس نے ایسا محسوس کیا جیسے کسی غار کے سامنے کوئی بھاری پتھر رکھا ہو اور اندر سے کوئی زور زور سے دھکے دے رہا ہو۔ نہیں اُمی اُس کے متعلق کبھی ایسی بات نہیں سوچ سکتیں ـــــ آخر یہ کالج کے لڑکوں کی اتنی دشمن کیوں ہیں ـــــ کالج کے لڑکے نہ ہوئے "ہوّا" ہو گئے۔ اب ایسا بھی کیا بچارے پردیسی ہیں۔ کتنے دن مکان خالی پڑا رہا مگر اُمی کو تو دُھن سوار تھی کہ کسی کالج کے لونڈے کو نہ دونگی۔ آخر جھک مار کر دیا نا ـــــ اب کون سے غیب سے اللہ میاں نے آ تا رے ہیں انکی باتوں کو تو بس اللہ ہی سمجھے۔

"تم لونڈیں ان ...دست بولا کر دیتی ہیں۔ جب تم سمجھتے ہی نہیں تو کیوں بڑ بڑ کرتے ہو"

...ن کو یہ سوچ کر ہنسی سی آگئی۔ کتنے لڑکے مکان کے لئے آئے۔ پیشگی کرایہ تک دینے کو تیار تھے۔ مگر اُمی کو تو ایک "نہیں ـــــ نہیں" کی رٹ سوار تھی۔ کالج قریب ہے ور یہاں کام ہی کس کا ہے جو آتا۔ یا تو پھر مکان ہی کسی دفتر کے پاس بنوایا ہوتا جو کوئی کلرک اپنی بیوی اور ایک درجن "چیلی چاپڑ" سمیت آ کر لیتا۔ وہ برابر ہاتھ چلائے جا رہی تھی۔ ایک مرتبہ جو اُس نے تیزی سے ہات چلائے تو بالوں کی ایک لٹ بل پڑ گئی۔ کاش وہ دیکھ سکتے۔ پھر وہ جھینپ سی گئی، اور بالوں کو ایک جھٹکے سے پیچھے ڈال دیا۔ بڑا تنگ کرتے ہیں یہ بھی اور پھر لمبے بھی تو ہیں غضب کے "کالے ناگ" اب وہ اردو شاعری کے جمالیاتی حس سے لطف اندوز ہونے لگی، سچ مچ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں یہ شاعر پھر اس نے نیچے جھک کر غور سے دیکھا۔ چند لڑکے

آنگن میں بیٹھے "مرغ کی طرح پر پھلائے" دھوپ کھا رہے تھے ــــ دروازہ ــــ ان میں انکی صورت نظر نہ پڑی نہ جانے کیا حال ہوگا۔ بچارے پڑے ہیں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔ کاش وہ جا سکتی۔ مگر اس کو کیا پڑی ہے۔ وہ اس کے کیا ــــ نوشو آگے سوچنا نہیں چاہتی تھی اور اسی لئے اس نے جھٹ پٹ پر سے دوا اٹھائی اور لڑکے کے حوالے کردی جو دیر سے دوا کے لئے کھڑا تھا۔ ستون کی طرح بے حس اور اپنی ناک سے ایک مقررہ وقفہ کے بعد سڑ... سڑ کی عجیب سی آواز نکالتا جاتا تھا البتہ کبھی کبھی ذرا سی جنبش کرتا۔ وہ بھی اپنی انگلی کو ناک کے سوراخوں میں پھرانے کے لئے جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو

"کیسی طبیعت ہے تمہارے صاحب کی؟"

"صاحب کی۔" وہ اپنے دلچسپ مشغلہ سے چونکا۔

"جی ہاں بہت خراب ہے کئی روز سے کچھ کھایا بھی نہیں ــــ وہ پھر جیسے کچھ سوچنے لگا" اور چارپائی سے اٹھ بھی تو نہیں سکتے۔"

نوشو کے جی میں آیا کہ کہہ دے "پرہیزی کھانا پکوانا ہو تو بتا دیں، میں خود پکا دونگی ــــ آج کالج کا کام نہ ہوگا نہ سہی ــــ مگر یہ کہتی ــــ امی کی آواز اسکے تخیل میں گونجی "ابھی کیا کھانا بھی پکنے لگا۔" اس کی آنکھوں کے سامنے غصہ میں بھری ہوئی امی کی شکل ناچ گئی ــــ اور ان کی بات بھی ٹھیک ہی تھی۔ نہ جانے انکو کیوں دشمنی ہے کالج کے لڑکوں سے۔ اگر کہیں وہ لڑکا ہوتی اور اس کالج میں پڑھتی ہوتی ــــ اس نے غور سے لڑکا کو دیکھا۔ لڑکا [illegible] بیٹھا تھا۔ نوشو بھی اپنی چارپائی پر زندگی جا پڑی جیسے تھک کر چور ہوئی ہو۔ نہ جانے کتنی دیر

وہ اس طرح پڑی رہی۔

"نوشو"! امی کسی کام سے آئی تھیں وہ اُس کو اس طرح اوندھے منہ پڑے دیکھ کر گھبرا گئیں وہ یہ بھول گئیں کہ کس کام سے آئی تھیں۔" بیٹا ایسے کیوں پڑی ہو؟"

"کچھ نہیں ——— یونہی ذرا لیٹی تھی۔" اور وہ اُٹھ بیٹھی۔

"میں کہتی ہوں تو مفت میں ہلکان ہوتی ہے۔ یہ نگوڑ مارے کالج کے لونڈے تو آئے دن بیمار ہی رہتے ہیں۔ کھا لیا ہوگا کچھ" انم ——— غلم۔ آپ وٹ پوٹ کر اچھا ہو جائے گا۔ کوئی کہاں تک ان کی خدمت کرے۔ تو اپنے ہاتھوں میں زبردستی ٹھیٹیں ڈلائے دیتی ہے۔ ذرا دیکھ تو اپنی شکل آئینہ میں ——— منہ پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔

"نہیں۔ اُمی کچھ بھی تو نہیں ———" اوندھے منہ۔ لیٹنے سے اُس کے بال چہرے پر بے ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے۔ اُس نے جھٹک کر پیچھے ڈال لیے۔ لیکن اس بار اُسے ان "کالے ناگوں" میں ذرا بھی تو مزا نہ آیا۔ اُلٹی اُلجھن ہو رہی تھی۔

اُمی جیسے تیوریاں چڑھاتی جھلتی آئی تھیں ویسے ہی واپس چلی گئیں۔ نوشو پھر ایک بے نام خلا میں کھو گئی۔ جیسے ہوا میں پرواز کر رہی ہو۔ اسکی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے ہوائے تھپیڑوں کے ساتھ کسی کے کراہنے کی مدھم مدھم آوازیں آنے لگیں۔ شاید زیادہ بیمار ہیں۔ کوئی پرساں حال نہیں اُسکو غصہ سا آنے لگا۔ اُس نے یونہی میز پر سے کتاب اُٹھائی اور ورق گردانی کرنے لگی ——— ہاتھ اپنے کام میں مشغول تھے۔ دماغ اپنی فکر میں غلطاں و پیچاں ——— ایک دوسرے سے بہت دور۔ وہ ان الجھنوں کو کاغذ کے ان اوراق میں سمیٹ دینا چاہتی تھی کہ شعور و لاشعور کی گہرائیوں اور پہنائیوں سے

انکو نکال کر پھینک دے ـــــ لیکن خیال کی لہریں ـــــ یہ لہریں ساحل سے آ کر ٹکراتی ہیں اور ہمیشہ کے لئے ندی کی آغوش میں کھو جاتی ہیں۔ پھر اُسی لمحہ دوسری لہریں یکے بعد دیگرے اپنے وجود کا احساس دلانے کے لئے آتی جاتی ہیں۔ جیسے پرکار گردش کرنے کے باوجود اپنے محور پر قائم رہتا ہے یہ گہرائیوں سے اُبھر کر پھر اپنی گہرائیوں میں چلی جاتی ہیں تاکہ ان کے وجود کا یہ لامتناہی سلسلہ یونہی زندہ جاوید رہے۔ ورق پر ورق الٹتے جاتے ہیں پھر ان کے پلٹنے کا فعل یونہی جاری رہتا ہے۔ نوشابہ کو ایسی محبت تو نہ تھی، پھر بھی ہمدردی کے تمام جذبات یونہی آتے اور ختم ہو جاتے۔ وہ بچھڑنے لگے سے اس کے دماغ میں جنم لینے لگے۔

کراہنے کی دھیمی دھیمی آوازیں رات کے سناٹے میں گونج رہی تھیں۔ فضا میں ایک ہلکا سا ارتعاش پیدا ہو گیا تھا جیسے بربط کے تاروں سے آواز نکلتی ہو جیسے کوئی متواتر کُوکُو کرتی ہے تاکہ کوئی بچہ سسکی کی آواز کو پھر کوئی سمیٹ پائے کیا اس کا سلسلہ بھی یونہی لامتناہی سا ہے۔ اس نے یہ محسوس کیا جیسے یہ آئین کائنات کے ہر ذرہ میں پنہاں ہیں۔ کتاب کے ہر ورق کے ساتھ پیوست ہیں اور فضا میں ان مہین ذروں کی طرح تیر رہی ہیں جو خورد بین کی مدد سے بمشکل نظر آتے ہیں۔ اس نے اپنی ہر جنبش کو جیسے روک کر ختم کر دی تھی لیکن یہ کبھی نہ ختم ہونے والی کیفیت ایک جنبش سے ختم ہوتی ہے۔ اس کی نظریں کتاب پر ایک جگہ جم کر رہ گئیں۔

• نفسیاتِ سرمایہ داری کا یہ عیب ہے کہ آج اپنے آنسو پینے کے لئے

میدان میں کود پڑی ہے وہ اپنے اُس تاریک مستقبل کی طرف بڑھ رہی ہے تاریخ کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے کر پیچھے کو موڑنا چاہتی ہے۔ لیکن کیا تاریخ کے قوانین اتنے کمزور ہو گئے۔ وہ اپنے کو اتنی آسانی سے قنطائیت کے غار میں ڈھکیل دیںگے۔ جہاں چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے — گھٹا ٹوپ — جس میں ادھ مرے انسان کراہ رہے ہیں "

توشو چونک پڑی جیسے وہ کسی اور ماحول میں پہنچ گئی تھی — ایسا معلوم ہوا جیسے وہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والا خواب دیکھ رہے تھے۔ لیکن پھر ماحول کی اداسی نے اسکو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا دیا اس نے محسوس کیا جیسے کوئی کراہ رہا ہے، جیسے ساری فضا میں قنطائیت کی حکومت ہے۔ اس کا یہ گھر بھی تو قنطائیت کا روپ دھارن کئے ہوئے ہے۔ جہاں — اس نے اپنے خیالات کے روشندان کو بند کر دیا، نہیں، وہ انھیں اپنے دماغ کے محل میں گھسنے نہیں دیگی ہوگا کوئی بیمار — وہ پھر کتاب کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ہوا چل رہی تھی۔ کتاب کے ورق پھڑ پھڑا رہے تھے۔ ایک دوسرے کے تھپڑ مار رہے تھے۔ اس سے انکا یہ جھگڑا نہ دیکھا گیا اور اس نے پٹاخ سے کتاب بند کر دی، لیکن جب اس نے دوبارہ اس کو کھولا تو زیادہ تر ورق مڑ چکے تھے اور بعض تو پھٹ بھی گئے — لو یہ ہے تمھاری سزا آپس میں لڑنے کی۔ توشو نے پھر کتاب کو پڑھنا شروع کر دیا اس کا ذہن تو جیسے ہوا میں اُڑ رہا تھا نہ جانے یہ کتاب کے حروف اُڑ اُڑ کر اس کے ذہن میں دھنسے جا رہے تھے یا اس کے ذہن سے یہ خیالات نکل نکل کر کاغذ کی سطح پر جم رہے تھے —

ٹوٹ گئے ہوں وہ محبت کے پُرسوز راگ الاپ رہا تھا، ٹوٹے ہوئے تاروں سے کتنا جگردوز نغمہ نکل رہا تھا ـــــ کیا نسانیت کی آواز میں بھی اتنا ہی سوز ہوگا ـــــ وہ چونک پڑی شمو میاں کھڑے باجی کے بالوں سے کھیل رہے تھے۔

"باجی ـــــ باجی ـــــ کالج کے لڑکے بیمار نہیں ہیں، اچھے خاصے تو ہیں۔"

"کالج کے لڑکے ـــــ" اس نے اس سے زیادہ اور کچھ نہ سُنا ـــــ وہ بھپر گئی۔

"یہ بھی کوئی نام ہے کتنا دفعہ سمجھایا کہ بھیّا اس طرح نہ کہا کرو مگر وہ تو مانتا ہی نہیں ـــــ کلّے کلّے کو نچوں گی تیرے ـــــ شریر کہیں کا ـــــ" نوشو نے دانت پیسے۔

"امی بھی تو یہی کہتی ہیں" اُس نے اپنی مدافعت کرتے ہوئے کہا۔

"ان کی تیری ریس ہے۔ بڑا چلا ہے برابری کرنے" شمو چور سا ہوگیا۔ نوشو پھر کچھ بولی۔

"ہاں تو کیا کہہ رہا تھا تو ـــــ؟"

"میں کہہ رہا تھا ـــــ باجی ـــــ یہ کالج کے لڑکے جو ہیں نا" ـــــ اور وہ پھر گھبرا گیا کیونکہ باجی کی آنکھیں لال انگارہ سی ہوگئیں تھیں۔ لیکن وہ پھر ہنس پڑی۔

"اب نام نہیں یاد آتا تو کیا کروں" ـــــ اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "تو یہ جو ہیں بیمار تھوڑا ہی ہیں ـــــ بنتے ہیں" ـــــ اس نے منہ بنا کر کہا۔

نوشو نے اُسے گود میں بٹھایا اور اس کے نرم نرم گالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی "تجھے کیسے معلوم"؟

"میں جو گیا تھا ـــــ نا ـــــ ابھی" اس نے آنکھیں جھپکا کر کہا "پہلے تو سب کے

—— سچ سچ اس کا شکوہ بجا ہی تو تھا، آخر کوئی کہاں تک اس طرح رہے۔ کتنے دن گذر گئے اور میں نے یوں ہی ورق گردانی شروع کر دی کتنی کہانیاں چھپی ہوئی ہیں ان اوراق میں۔ اور اب اتنے دن سے یہ خاموش ہے گویا میں ڈائری سے الگ ہو گئی تھی۔ اپنے دماغ سے —— وہ وقت کتنا دور نکل گیا جب میرے دماغ اور ڈائری کے اوراق میں تھوڑی دیر کے لئے مناسبت ہوتی تھی —— ایک خاص لمحہ کے لئے۔ اب اس کی خانہ پُری کرنی ہے لاؤ لکھ دوں نہ جانے پھر کب وقت ملے۔ مگر پہلے تو اس اجڑے گھر کو ٹھیک کرنا ہے۔ چار دن نہ رہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے گھر نہیں لکھنؤ کا نخاس ہے۔ ہر چیز بے ہنگم طور سے منتشر۔ سچ ہے بلا عورت کے کم از کم ہندستانی گھر تو گھر نہیں رہتا ہے۔ کتنی بار بھائی جان نے کہا —— "شادی کرو —— شادی کرو۔ ایک اچھی سی بھابی آجائے گی اور ساتھ ہی گھر بھی سلیقہ کا ہو جائے گا —— اس طرح کب تک نبھے گی۔"

"بس رہنے دے، زیادہ باتیں نہ بنا۔ بڑی آئی بھابی والی، میرا گھر بلا بھاری بھابی کے بھی ٹھیک ہے۔"

"اچھا —— جانے دو میرا کیا بگڑتا ہے۔"

اب جو تھوڑے دن کے لئے گئی تو میاں کو پتہ چل گیا۔ دال آٹے کا بھاؤ۔ گیا۔ تین دن تک گھر تو گھر سا بن گیا۔ ابھی پہلے تو اس سے نپٹنا ہے —— ... تنے عرصے تک گیا ہے کیا ہو گیا —— دنیا کہاں سے کہاں چلی گئی اور ... دن کے پیچھے ... معصومیت سے مجھے تک رہے تھے۔ کتنے

بے داغ ہیں یہ بیوہ کے براق کپڑوں کی طرح

میں نے ڈائری کے اوراق پلٹنے شروع کردیے۔ چیونٹیاں رینگ رہی تھیں، ٹڈیوں کے دل کے دل آسمان پر چھائے ہوئے تھے۔ مجھ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ڈائری کے اوراق ماضی کی لاشیں کھینچ کر میرے سامنے لا رہے تھے ـــ دیکھو کون کہتا ہے کہ گیا وقت پھر واپس نہیں آتا۔

چہار باغ اسٹیشن کا نقشہ میری آنکھوں میں پھر گیا۔ وہی شاندار عمارت جیسے آج ہی بنا کر کھڑی کی ہو۔ وہی مانوس پرانی آوازیں "گنڈیری ـــ گُلی ـــ لکھنؤ کی گلاب ریوڑیاں ـــ کھٹیاں ـــ لکھنؤ کی تازی کھٹیاں ـــ یہ آوازیں میرے تخیلی کانوں میں دھنسی جا رہی تھیں ـــ "شمع" کا ایک پرچہ میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ تمام سفر میں اسی قسم کی چیزیں پڑھوں گی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں پرندہ فرشتہ کی طرح اڑتی چلی جا رہی تھی فضا میں بلند بہت بلند مگر بار بار مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اب بھی کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے اور ماضی کے سپنے الجھنے لگے۔ ماں کی بھیانک شکل سے مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ "زندگی سے بھاگ کر کہاں جاؤ گی" یہ کس کی آواز تھی جس نے جاتے جاتے ڈرا دیا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ سپنے الجھ رہے تھے اور وہ غائب۔ آخر کوئی ان سے کس طرح نجات پائے۔

میں اپنے کمپارٹمنٹ میں آ کر بیٹھ گئی۔ اب شمع سے پڑھوں گی۔ یہ خوب صورت تصویریں۔ ہندستان کے قدیم فن تعمیر کی بہشتی ہوں۔ یہ ہوں وہ عجائب ہندستان کے گوشہ گوشہ سے سوغات کی بہار ـــ وہ پھر ان کی زینت بنے

عجیب و غریب جوابات ـــــ مس سلوچنا کے پتہ کی کس منچلے نوجوان کو ضرورت ہے۔

" محکمۂ آثار قدیمہ کی طرف رجوع کیجئے"۔ میں بمشکل اپنی ہنسی ضبط کر سکی۔ یہ مسافر کیا کہیں گے اور وہ بڑے بڑے بالوں والا نوجوان کیا سوچے گا جو اتنی دیر سے پورے کمپارٹمنٹ کو سر پر اٹھائے ہوئے تھا۔

" ہندستان کی آزادی آج خواب و خیال ہو گئی ہے"۔

" ہندستان کی آزادی" جیسے کسی نے اُڑتے ہوئے پرندے پر پتھر مار دیا اور وہ تڑپتا ہوا نیچے گر پڑے۔ میں نے رسالہ پر سے نظریں اٹھالیں جی میں تو آیا کہ کہدوں ـــــ

"جناب والا ـــــ ہندستان کی آزادی دیکھنا ہے تو محکمۂ آثار قدیمہ کو رجوع کیجئے۔ اس کے کھنڈرات ہی آپ کو مل سکتے ہیں"۔

" کلکتہ میں مسلمان ـــــ" کسی نے پیچھے سے کہا۔

" معاف کیجئے گا وہاں اکثریت ہندؤں کی ہے"۔

اوہنوں ـــــ" میں نے سر کو زور سے جھٹکا دیا جیسے کوئی مکھی ناک پر آکر بیٹھ گئی ہو۔ میں نے پٹ سے رسالہ بند کر دیا اب تم بحث ہی کر لو تو پھر میں پڑھوں۔

" بابو ـــــ کال کتے ـــــ میں عورت پر دن دھاڑے حملہ ہوتا ہے"۔

" کال ـــــ کتے ـــــ ـــــ"

ٹھیک کہتی ہے بنگال کی ساحرہ ـــــ تو نے کلکتہ کا بڑا اچھا تجزیہ کیا۔ سچ مچ یہ وہ شہر ہے جہاں انسان کال میں بھوکے مرتے ہیں اور کتے کی طرح لڑتے ہیں۔ اور پھر یک بیک گاڑی نے بھی تو جیسے میرے اس خیال پر صدائے احتجاج بلند کیا ٹرین یک دم رک گئی اور ہم سب کے سب ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔

اس کی ہی سُن لے۔ میرا دماغ چپ ہوگیا۔ جیسے بندر اپنے مداری کی ڈانٹ کھا کر سُن ہو جاتا ہے۔

"ملک میں ہر طرف انقلاب کی آگ بھڑک رہی تھی۔ کسان مزدور ایک ہوکر میدان میں اُتر آئے تھے۔ فوجیوں نے شہنشاہیت کی بنیادوں پر وار کیا، ریاستی عوام راجاؤں اور نوابوں کے پانسے پلٹنے لگے۔ ہر طرف آزادی اور زندگی کی چہل پہل نظر آ رہی تھی۔"

"بہت اچھا کیا ـــــ اور کیا کرتے؟ میرا دماغ بگڑ گیا اور ایسا بگڑا کہ مجھے بھی روکنے کی ہمت نہ ہوئی۔

آخر کوئی کہاں تک ڈرے، کہاں تک گولیاں کھائے، کہاں تک جیلوں میں سڑے۔ فوجی قوانین توڑنا آزادی کی لڑائی ہے یا بغاوت ـــــ غنڈہ گردی؟ ـــــ ریلوں اور ڈاک کی ہڑتالیں کرنا ملک کو بھوکا مارنا ہے یا زندگی کے لئے جدوجہد ـــ؟ بیوقوف کہیں کے ـــــ اگر ان پر ظلم ہوتا ہے تو چپ کیوں نہیں رہتے۔ کمبختوں میں اتنی بھی سکت نہیں۔ اور اس پر دعویٰ ہے کہ گاندھی کے ہندستان میں رہتے ہیں۔ بھوکے مرنا تک نہیں جانتے۔" میرا جی چاہا کہ ایسا قہقہہ لگاؤں کہ پورا کمپارٹمنٹ گونج اُٹھے۔

میرا دماغ آندھی اور طوفان کی طرح چل رہا تھا، ہمت نہ ہوئی کہ کچھ کہوں کہیں مجھے بھی اپنے زور میں نہ بہالے جائے۔ میں اور سکڑ کر بیٹھ گئی۔ گاڑی رینگنے لگی۔ سامنے کی سیٹ پر ایک نوجوان عورت اپنے بچے کو کھلے سے لگائے بیٹھی تھی۔ دوسری طرف ایک مسلمان نمازی پوری سیٹ پر دوسروں کا حق مارکر

اپنی نماز میں مصروف تھا۔ اس کے ماتھے پر سجدہ کرتے کرتے ایک سیاہ دھبہ پڑ گیا تھا جو قیامت کے دن "سرچ لائیٹ" کی طرح چمکے گا اور وہ بنگالی ساحرہ اس کی آنکھوں میں بھوک اور خوف کے سے جلے اثرات وقت کے ساتھ نمایاں ہوگئے تھے اور اب مستقل اس کی آنکھوں میں پناہ گزیں تھے۔ نوجوان عورت اپنے بچے کو تک رہی تھی۔ جیسے اس کی آنکھوں میں مستقبل کی جھلکیاں دیکھ رہی ہو۔ نہ جانے اس کو اپنے لال سے کیا کیا توقعات تھیں حالانکہ ابھی تک وہ اس کی چھاتی پر سر پیٹ رہا تھا۔ مجبور ہو کر ماں نے شرماتے ہوئے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور جمپر کے گلے سے اپنی تندرست چھاتی نکال کر بچے کے منہ میں ٹھونس دی ——— "لے پی ——" اور پھر انھیں سپنوں میں کھو گئی۔

بوڑھا نمازی جس کے ماتھے کا نشان ——— برسوں کی محنت کا سرٹیفکیٹ تھا۔ جس کا پھل ابھی اسے نہیں ملا تھا۔ اس کی آنکھوں میں روحانی چمک دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اپنی عبادت ختم کر چکا تھا۔ مگر تسبیح ابھی تک کھٹ کھٹ چل رہی تھی۔ وہ بڑے بالوں والے نوجوان کی طرف گھورا ... تھا جیسے کہہ رہا ہو ——— "کیا فائدہ ——— دنیا میں فضول وقت ضائع کر رہے ہو۔ عاقبت کی بھی کچھ فکر کرو۔ یہ جوانی ہمیشہ نہ رہے گی۔ اصل دنیا تو وہی ہے جہاں مستقل رہنا ہے" اور پھر وہ بوڑھا جیسے اپنے مستقبل میں کھو گیا۔ شاید جنت اور حوروں کے حسین تصور میں گم ہو گیا۔ جس نے ذرا دیر کے لئے اس کو اپنے ماحول سے الگ کر دیا تھا۔

"میری آنکھوں نے کلکتے میں وہ سین دیکھے۔ انسانیت کے مستقبل کی بھیانک تصویریں۔ انسانوں کے سرمایہ کاروں کے آہنی گھروں سے نکلے ہوئے سرد پڑے ہوئے

ہوئے ـــــ اپنے ملک کی بے بسی پر دانت نکالے ہوئے ـــــ"

در میرا دماغ میری اجازت کے بغیر بول اُٹھا۔

واہ کیا ـــ کیا اچھا لگتا ہوگا وہ منظر ـــــ ـــــ میں خوف سے کانپ گئی۔

چپ بدذات ـــــ آدمیوں کے سر ـــــ میرے تو جسم کا ایک ایک رونگٹا کھڑا ہوگیا اور تو انھیں دیکھنا چاہتا ہے۔

"کیوں نہیں ـــــ؟" اس نے بہادری سے جواب دیا۔ مذہب کا پیغام سنو جب انسانوں کے سر پار کوں کی چہار دیواری پر سجائے جائیں گے تو یہ آدمیت کی معراج ہے۔ ہر مذہب کا اصول انسانیت کی بنیادوں پر قائم ہے۔ بنگال میں انسانیت مرچکی ہے مگر مذہب زندہ ہے ـــــ انسان مرچکا ہے۔ ہندو مسلمان زندہ ہیں۔"

"کلکتہ اور بمبئی میں خون کی ہولی کھیلی جارہی ہے اور ہمارے رہنما ابھی تک یوں سے ہی بات چیت کر رہے ہیں" بڑے بالوں والے نوجوان نے پھر کہنا شروع کیا۔ اس کی آنکھوں میں موت رقص کر رہی تھی مگر پیشانی اب بھی اسکے زمانے کی چغلی کھا رہی تھی۔

"نہیں ـــــ آج بھی ہم ان تجاویز کو ٹھکرا کر اسی کلکتہ اور بمبئی کو انگریزی شہنشاہیت کے خلاف جنگ آزادی میں تبدیل کر سکتے ہیں۔"

"بیوقوف ـــــ بہت اچھا ہو رہا ہے۔ دیکھتا نہیں ہندستان کی آبادی کس قدر بڑھ گئی ہے۔ آخر کہاں تک کم کھا کر زندہ رہ سکتے ہیں ـــــ راجندر بابو کا بیان نہیں سنا" میرے رکتے رکتے وہ بول ہی پڑا۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا جو کسی نے سُنا نہیں۔

اور پھر ڈائری کے اوراق بدستور میری آنکھوں کے سامنے کھلے ہوئے تھے
میں نے پلٹنا شروع کئے۔ ۲۷ راگست، ۲۸ راگست ـــــ میں ڈائری کے سپید
اوراق کو اُلٹتی جارہی تھی اور ۲ رستمبر پہ آکر تو جیسے ہاتھ خود بخود رک گئے۔

"دیکھو ـــــ اس دن ہندستان آزاد ہوا تھا" مجھ سے کسی نے پھر کہا ـــ میں
چونک پڑی خدا جانے کون تھا وہ جو بدستور کہے جارہا تھا۔

"مدراس ریلوے کی ہڑتال کو ایک ہفتہ ہوچکا تھا۔ ہندستان کی اکثریت
آزادی کی خوشیاں منارہی تھی کیا اس روز دوسرے کی وطنی کا چراغ گل ہوگیا
تھا؟" میں کیا جانوں ـــــ کوئی تب دیکھنے گئی تھی؟ مجھے غصہ آیا۔ نہ جانے
کون ہے جو چپ ہی نہیں ہوتا۔ نہ جانے اس کے دماغ میں کیا بھرا ہے۔

"اور پھر مدراس ریلوے کے مزدوروں پر تڑاتڑ گولیاں چلیں"

"گولیاں نہیں چلیں گی تو کیا پٹاخے چھوٹیں گے۔ بد [illegible] پسینے کا [illegible]
کرتے ہیں۔ جلوس نکالتے ہیں۔ ہڑتالیں کرتے ہیں۔ تنخواہیں بڑھاؤ۔ چاہتے ہیں
اور کیا لیں گے۔ کسی کے باپ کا گھر۔ [illegible] اتنے بڑے [illegible] سے روز
میں گذر کرتے ہیں۔ تم سے نہیں ہوتا ـــــ [illegible] ـــــ
کی تو ہندستان سے [illegible] جیسی کہ عزت ہے، تمہاری کیا شان گھٹ
جائے گی۔ اچھا کیا مدراس کے وزیر اعظم نے [illegible] حق [illegible]"

"مگر [illegible] آج بھی دیواریں کہیں گولیوں سے [illegible] ہیں"

"چپ رہو [illegible] بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بناؤ" مجھے پھر [illegible]
ایسے میں تلملا کر رہ گئی ـــــ

"یہ ہمارے حکمرانوں کا پرانا طریقہ ہے۔ تم چاہتے ہو کہ ملک غلاموں کے بنائے ہوئے راستوں پر چلے۔ یہ آزادی کی تحریکیں سب غلاموں کے راستے ہیں۔ گولیاں اور جیلیں آزاد حکمرانوں کا آئین"۔

میں لاجواب ہو گئی۔

اور ڈائری کو اٹھا کر پٹخ دیا۔ یہ سادہ اوراق میرا رہا سہا دماغ چاٹے جا رہے ہیں۔ کہاں تک لکھوں۔ اتنے دن وطن رہی ایک لفظ بھی تو نہیں پڑھا یہ ڈائری اسی لئے چھوڑ گئی تھی۔ ایک کتاب بھی نہیں لے جاؤں گی ــــ بھائی جان نے کتنا کہا ــــ "تمھاری ڈاک بہت جمع ہو گئی ہے۔ کہو تو بھیج دوں"۔

"نہیں ــــ ہرگز نہیں۔ آخر کچھ دن تو اس ماحول سے الگ رہ لوں۔

"امی۔ چائے بناؤ کتنے دن ہو گئے تمھارے ہاتھ کی چائے پئے ہوئے"۔ میں نے ماں سے کہا۔

دیکھو ادیب نہیں ہتی ــــ میرے ہاتھ میں کون سے لعل لگے ہیں اور تم نے آج کا اخبار دیکھا۔ کتنی دردناک خبر ہے۔ بنگال کی ــــ"

دردناک ــــ اچھا ــــ تو مجھے مت سناؤ۔ میں نے آج کل اخبار رسالے تک ہی پڑھنا چھوڑ دیا ہے"۔ میرا دماغ خوش ہو گیا۔ شاباش ــــ اور میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے اندر ایک چھپے ہوئے انسان کو قہقہہ لگاتے سنا مگر اس وقت بھی ڈائری کے سادہ اوراق مجھ کو حسرت سے تک رہے تھے۔ میں نے اٹھا کر اسے سینے سے لگا لیا۔ میری زندگی کی اکیلی ساتھی اور رازدار جس کے سامنے میرا ماضی، حال اور مستقبل ننگا کھڑا ہے ــــ میں نے اسکوپٹ سے بند کر دیا۔

بیگ لٹکا کر بازار جایا کروں گی۔ جوتوں پر پپ اسٹک، گالوں پر سرخی، آخر باپ کی طرح میں بھی قوم پرست ہوں ـــــــ نا ـــــــ

"بیٹی ـــــــ میں اپنے کسانوں ہی کو اپنے یہاں نوکر رکھ رہا ہوں۔ ایک روپیہ دو آنے مزدوری دوں گا اور پھر عید، بقرعید کی تیوہاری الگ۔ فصل کٹتے ہی یہ مزدور کچھ اس طرح سنہ کھوئے ہوئے رہتے ہیں جیسے یہ غلہ آسمان ہی سے تو برسے گا میری زمین نہ ہوتی تو کیا آسمان سے غلّہ اُگاتے۔ میرے باپ کی گاڑھے کی کمائی کی زمینیں ہیں سو روپے ماہوار کماتے تھے، دو دو گھوڑے، ٹم ٹم رکھتے تھے، سدا اچھا کھایا پہنا، ہمیشہ کوٹھی میں رہے اور مرتے وقت پچاس ہزار کی جائداد چھوڑی۔ اور کیا ـــــــ ایک تمھارے بھائی جان ہیں ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کماتے ہیں۔ اور پندرہ دن میں تلاش۔ دادا کے چھوڑے ہوئے مکان میں ایک اینٹ تک نہ لگائی۔

"چپ ـــــــ تو کون ہے بیچ میں بولنے والا" میں نے اپنے دماغ کو ڈانٹا۔

"اور کیا غلّہ ـــــــ آسمان سے نہیں تو کیا زمین سے برستا ہے؟" دماغ کی گاڑی پھر چل نکلی "ہمارے ملک کی زمین بانجھ ہو گئی۔ اب اس میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے۔

"چلو اچھا ہی ہوا" میں اپنے خیالات میں پھر بہہ گئی "زمین بھی بچ گئی اور زمینداری بھی ختم ہو گئی۔ اور میرا باپ لیڈر کا لیڈر بنا رہا۔ سانپ بھی مر گیا۔ لاٹھی بھی نہ ٹوٹی ـــــــ"

میں واپس آ گئی۔ ابھی تو سینکڑوں خطوط کے جواب لکھنے ہیں ـــــــ کتنی

کتنی کہانیاں لکھنی ہیں۔ آج کل تو ہندستان میں اناج کی جگہ "رسالے" اُگ رہے ہیں۔ ہر ڈاک میں ایک نہ ایک نئے رسالے کے لئے "تازہ کہانی" کی فرمائش ـــــ لیکن کوئی بندۂ خدا یہ نہیں لکھتا، کہانیاں لکھتے لکھتے تیرا دماغ تھک گیا ہوگا، تیری تندرستی خراب ہوگئی ہوگی، تیرے دماغ اور جسم کو کس سکون اور آرام کی ضرورت ہے۔ جیسے لوہے کی مشین ہے جو بلا خوراک و آرام کے دن رات چلتی ہی رہتی ہے۔ اور ڈائری کے سادہ اوراق الگ حیرت سے مجھے تک رہے تھے۔ ابھی تو دو ماہ کی خانہ پُری کرنا ہے ـــــ دیکھئے کب وقت ملتا ہے ـــــ پہلے اس منحوس دماغ سے تو چھٹکارا ملے۔

اِندرسبھا

پتے کیوں کاٹے؟۔۔۔ کوئی وہ ہماری نیچ ذات تھوڑی ہے۔ وہ کھرچی پہ بیٹھے ہے" راجو کچھ مطمئن سی ہوگئی۔

"ماں تونے وہ گجراتن دیکھی ہے۔۔۔ کتنا لمبا گھونگھٹ کاڑھتی ہے"۔

"کون۔۔۔ گجراتن؟"۔۔۔ ماں ایک لیکھ ناخون پر چٹخاتے ہوئے بولی۔

"وہی بنئے والی۔۔۔ ماں اس کا مرد تو بالکل ہی بڈھا ہے"۔

"لے اچھا میرا سر ٹٹول"۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر کھجلایا۔ راجو نہ جانے کس دھیان میں اُٹھ کر اُس کا سر ٹٹولنے لگی۔ مگر اس کے ذہن میں گجراتن بسی ہوئی تھی۔

"ماں ۔۔۔۔ گجراتن کا وہ ننھا سا بچہ کیسا گورا گورا ہے۔ بالکل ویسا ہی جیسا وہ بابو جی [illegible] کے گھر آتا ہے"

"چپ رنڈی۔۔۔ تجھے کیا پڑی ہے" راجو منہ بسور کر الگ جا بیٹھی۔

"چل ادھر" راجو اپنی جگہ سے نہ ہلی اور منہ لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اسکی ماں آنکھیں گاڑ کر جوئیں [illegible] نے لگی۔

"لے اس میں جوں دیکھ۔۔۔"

"اُوں ۔۔۔ اُوں۔۔۔ میں تو نا دیکھتی"۔ راجو روٹھ گئی۔

"اچھا اُٹھ ۔۔۔ شام کو منشی سے پیسے لے کر دوں گی"۔

راجو نے اُٹھ کر چوٹی تھام لی اور ماں اپنی آٹھ گزی ساڑی کو نیچے سمیٹ کر بیٹھ گئی، جو کپڑا نہ ملنے کی وجہ سے ایک گز کم کردی گئی تھی ورنہ ہمارا شی رسم کے مطابق نو گز سے ایک سوت کم کرنا بھی بڑی بری بات ہے۔

"ماں ــــ اب میں تیج کی دھوتی نہ پہنوں گی پوری تو بھی دوں گی ــــ اور پھولدار چولی۔"

"بڑی تیرے کھسم کی کمائی ہے نا ــــ جو تو بھی دھوتی اور پھولدار چولی پہنے گی۔" راجو نے منہ پھلایا۔

"دلاری بھی تو پہنتی ہے ــــ کتنی اچھی لگتی ہے۔"

"دلاری کی اور تیری ریس ہے ــــ وہ ہے بھی تو بارہ تیرہ برس کی۔ چار پیسے کماتی ہے۔"

راجو نے ماں کی چولی اٹھا کر پرے کو ڈال دی ــــ خود تو ہر دیوالی پر نئی سلواتی ہے۔ اس نے غصے سے ماں کی طرف دیکھا جو گھاس پر دھوپ میں پڑی اینڈ رہی تھی۔ پھر راجو ماں کے ننگے بدن کو تکنے لگی۔ پیٹ۔ پیٹ پیٹ ــــ کیسی موٹی ہے ماں ــــ پھر اس نے اپنے پیٹ کو دبا کر دیکھا ــــ ذرا بھی نرم نہیں اس کا جی چاہا کہ جاکر ماں کے نرم نرم پیٹ کو دبائے ــــ پھر [illegible] ماں مارے گی [illegible] کی ہمت نہ پڑی۔ وہ پھر اس کے ننگے بدن کو دیکھنے لگی۔ [illegible] کیسی اچھی چولی پہنتی ہے۔ بڑی ہو کر [illegible] ہو گی ــــ [illegible] پھر اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ خود بھی ایک ننھی سی [illegible] ہے [illegible] لہنگا اور پولکا پہنے ہوئے ــــ پٹکے سے باہر نکلی [illegible] میں چربی کی وجہ سے ناف کا نشان گہرے غار کی مانند [illegible] اور بہ [illegible] ــــ کھوٹ ــــ راجو ٹھہر گئی ــــ [illegible] دیکھی جاتی تھی۔ بڑی تو ہے پر کیسا ڈرتی ہے [illegible] پھر [illegible]

اور ٹھیکیدار کی گالیاں ایک ایک کرکے اس کے ذہن پر چھانے لگیں۔ گالیاں تو اس کو سب یاد ہو گئی تھیں۔ وہ اکثر للتا اور دلاری کو دے بھی دیتی تھی۔ وہ کھیل کھیل میں منشی اور ٹھیکیدار بنتی اور اپنی ساتھ کی چھوکریوں کو خوب خوب گالیاں اڑاتی ــــ بڑی عجیب عجیب گالیاں، اُسے بعض وقت ان گالیوں پر ہنسی آتی۔ مگر اس کو کتنا بُرا لگتا جب وہی گالیاں اس کی ماں کو دی جاتیں ــــ پر نہ جانے کیوں اُس کی ماں ذرا بھی تو بُرا نہ مانتی ــــ چھوٹے بھیا تو اور بھی گندے ہیں، کیسی بُری بُری گالیاں دیتے ہیں اور اُس کی ماں بس ہنس دیتی، اس کا منہ تمتما اُٹھتا، وہ ہنستی ہی چلی جاتی۔ جبھی تو چھوٹے ٹھیکیدار نے ماں کا نام "پھلجھڑی" رکھا ہے۔ کل چھوٹے ٹھیکیدار نے ماں کو کتنی گالیاں دیں۔ پھر ذرا دیر بعد دیکھو تو خوب ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہے اور شام کو تو ایسے خوش ہوئے کہ اپنا کمرہ بھی اس سے جھڑوایا۔ کتنی ہی دیر کواڑ بند کئے ایک ایک چیز ٹھیک کروائی۔ اور پھر وہ سوچنے لگی۔ کمرہ جھڑواتے وقت چھوٹے ٹھیکیدار دروازہ کیوں بند کر لیتے ہیں ــــ پھر جھاڑنے کی آواز بھی تو نہیں آتی اور نہ ماں کی ہنسی کی آواز آتی ہے وہ سوچ میں پڑ گئی ــــ ماں اپنی خوشی سے نہ جانے کیا کیا کرتی ہے؟ ان کواڑوں میں سوراخ بھی تو نہیں جو جھانک کر ہی دیکھتی۔

رجو سوچتے سوچتے تھک گئی، اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا ــــ وہ یہ سب کیا دیکھتی ہے اور اس کے کیا معنی ــــ اور وہ پھر مایوس ہو کر ماں کے پاس لوٹ کھنے لگی۔ آج نہ جانے کیوں اس کے دل میں عجیب طرح کی گدگدی اٹھ رہی تھی ــــ سینے میں جیسے چیونٹیاں رینگ رہی ہوں اور پھر وہ سرسراہٹ دھیرے۔

بھی تو دیکھو ـــــ جب بھی کوئی کام ہوگا تو چھینا ہی کو بلائیں گے۔"

"پھر کیا ـــــ دوسری بولی: "کیسی نئی چولی پہن کر ٹھک ٹھک کر چلتی ہے۔"

کتنی دیر وہ یہی باتیں کرتی رہی ۔ مگر راجو ایک بات بھی نہ سمجھ سکی اسکو تو ماں کی ریں ریں لگی ہوئی تھی۔

"کیوں ـــــ مری جاتی ہے۔" راجو کی ماں نے ایک دھپ رسید کیا اور اسکی ریں ریں دہاڑوں میں بدل گئی: "اتنی بڑی سنڈی کو روتے ہوئے لاج بھی تو نہیں لگتی۔" مگر راجو بجائے خاموش ہونے کے اور بھی فیل بھرنے لگی۔

"لے پیسے" اسکی ماں نے نیانیا خولدار پیسہ اس کی مٹھی میں ٹھونس دیا۔ وہ چپ ہوگئی اور الٹ پلٹ کر پیسہ سے کھیلنے لگی۔

اسی ہماہمی میں راجو نے جنم لیا، اور اسی میں پل بڑھ کر تیرہ سال کی ہوگئی ـــــ دھان کی سوئیاں پھوٹ رہی تھیں یہ ابھی چند دنوں بعد لہلہاتی ہوئی کھیتی میں تبدیل ہو جائے گی ـــــ چاند اپنی چودھویں منزل پر پہونچ رہا تھا جس کے بعد ترقی کے منازل ختم ہو جاتے ہیں ـــــ لیکن راجو وہ چاند تھی جو مکمل ہونے سے پہلے ہی گھٹنے شروع ہو جائے ۔ تیرہ سال کی راجو بیس سال کی جوان عورت تھی جس کی جوانی، بھوک اور بیماریوں کے درمیان آتی ہی چلی گئی۔ اس نے اپنے ارد گرد کے حالوں کی بھی تو کچھ پروا نہ کی، مگر جوانی یہ کب دیکھتی ہے کہ کون اس کا استقبال کرنے کے لئے تیار بھی ہے یا نہیں ۔ وہ تو بے دھڑک مدہوش چلی آتی ہے ۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدم، تھرتھراتے ہوئے جسم اور بوجھل

آنکھیں اس کو خوش آمدید کہتی ہیں ــــ کس قدر نڈر ہوتی ہے یہ جوانی بھی،
آندھی اور طوفان کے بیچ دندناتی چلی آتی ہے ــــ جیسے سمندر میں طوفان ــــ
ہاں اسی طوفان میں آجو ایک ننھی مچھلی کی طرح تیر رہی تھی، دیکھتے دیکھتے وہ
کیلے کیا ہوگئی۔ اب اس کو منشی اور ٹھیکیدار کی گالیوں میں لذت محسوس ہونے
لگی ــــ وہ بگڑتا، ننگی ننگی گالیاں دیتا اور آجو اس کی آنکھوں میں آنکھیں
ڈال کر نہ جانے کیا ڈھونڈھتی ہے، اس کی اس دلیری پر دوسری چھوکریاں سہم
سی جاتیں" ــ کس قدر نڈر ہے یہ آجو، ڈرتی بھی تو نہیں۔ کہیں ٹھیکیدار
مار بیٹھے تو" ــ مگر آجو کے قہقہوں پر کوئی پابندی نہ تھی۔ رونا اور ہنسنا یہ تو
اپنی مرضی ہے۔ اور آجو خوب جی بھر کر قہقہہ لگاتی۔

"بہت غصہ آتا ہے، کیوں ٹھیکیدار صاحب۔" اس نے شرارت سے آنکھوں
کی پتلیوں کو گردش دی، ٹھیکیدار صاحب سٹپٹا [illegible] چپ [illegible] اس نے [illegible]
جھکی [illegible] بڑی شریر ہے یہ آجو کی بچی ــ چڑیل ــــ آجو جیسے [illegible]
بھی چھپ جاتی ہے۔

"کتنا ہنسنے لگی ہے" ــ منشی یہ کہہ کر اس کی چوٹی پر [illegible]
"دیکھ کے نہیں چلتے ــــ وہ یہ بھی کوئی بات ہے کیوں بات بات [illegible]"
"چپ حرامزادی۔ ورنہ جانے کتنی گالیاں اس نے [illegible] ــــ
ہاں اب تو آجو عادی ہو گئی تھی ٹھیکیدار کی گالیوں پر [illegible]
اس کو بُرا کیوں نہ لگتا تھا، پھر اس کا چہرہ کیوں تمتما اٹھتا، اس کے ہونٹ کیوں
کانپتے تھے۔ اور ایک عجیب سی ہنسی جو اس نے بہت چھپائی اس کے ہونٹوں پر

دیکھی تھی وہ آج اس کی آنکھوں میں رقص کر رہی تھی، ہم سب ایک ہی منزل پر چلتے ہیں۔ سماج کے بنائے ہوئے راستے پر، صاف چکنا راستہ ــــ جسکے ادھر اُدھر کانٹے بچھا دیے ہیں کہ نئی راہیں تراشی نہ جا سکیں۔

راجو نے اپنی ماں پر نظر ڈالی جس کی آنکھوں میں نہ جانے کتنی مایوسیاں جذب ہو چکی تھیں۔ جیسے یہ ہونٹ مسکراہٹ کو ترس گئے ہوں۔ جیسے ان گالوں نے کبھی ہنس کر جلتے نہیں بنائے جو سدا آج کی طرح بے رس رہے ہیں ــــ

چھوٹے ٹھیکیدار نے راجو کی طرف دیکھا اور پھر اُس کی ماں کو ــــ وہ راجو کی ماں جانشی کو بھیجدے ــــ اور وہ گردن جھکا کر چل دی۔ مگر پھر اُس نے ایک نظر چھوٹے ٹھیکیدار پر ڈالی، جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہی ہو ــــ

"ہاں بھیا" اب ان نینوں کی مدرا میں کوئی نشہ نہیں رہا ــــ اب تو یہ مدرا راجو کی نینوں میں بھری ہوئی ہے۔"

"راجو کدھر گئی چل تو۔"

اور راجو مسکرائی، اٹھلاتی اس کے ساتھ ہولی ــــ جیسے چڑھتا ہوا سورج۔ مگر شام ابھی بہت دور ہے۔ بادل کے ٹکڑوں نے سورج کو تاک لیا اور دشمن کی طرح اس پر ٹوٹ پڑے۔ اندھیارا ــــ بادلوں کی جیت ہوئی اور سورج ہار گیا ــــ بڑا مغرور بنتا تھا یہ سورج ــــ آج دیکھتے ہی دیکھتے اس کی جوانی لُٹ گئی ــــ آکاش کے تارے پردے کے پیچھے سے یہ منظر دیکھتے ہی رہ گئے۔

اندھیرے بھاگ میں پورے نو مہینے بعد راجو کی گود میں ایک ننھی مُنّی راجو آگئی اس کی مانگ میں سیندور نہ تھا مگر اس کی گود بھری تھی، اور راجو کی آنکھیں

جیسے مینھ برستے برستے تھما ہو ——— انسانیت کا ایک چھوٹا سا پیغمبر جس کو پناہ
دینے کے لئے کوئی تیار نہیں ——— معصومیت کا مجسمہ ——— تہذیب و تمدن کی
بجھتی ہوئی شمع ——— چھوٹی راجو چیخ رہی تھی ——— سرمایہ اور تہذیب کے
اَن دیکھے خداؤں کے حضور میں ———

اُس کی ماں زمین پر بیٹھی سامنے پڑی ہوئی بچی کو گھور رہی تھی۔ ننھا سا
گوشت کا سُرخ سُرخ لوتھڑا ——— اب سے چودہ سال پہلے کی راجو اس کے سامنے
تھی ——— ایسے اندھیرے بھاگ میں چراغ کی تھرتھراتی ہوئی روشنی میں ننھو راجو
نے جنم لیا تھا اور اب سے چودہ سال بعد یہ ننھی راجو بھی ——— جیسے خیالات کے
غبارے نکل نکل کر ہوا میں بہہ رہے ہوں ——— اندھیرے میں چراغ کی لو کانپ رہی
تھی ——— اُجیالے کی گود میں اندھیارے نے جنم لیا ——— اور اب دھرتی اور
آکاش اندھیارے کے چرنوں پر سر جھکائے تھے ——— نہ جانے کب تک سماج
کے ان سنسان راستوں پر اسی طرح کتنی ہی راجو ایسے ہی اندھیرے یگ میں
جنم لیتی رہیں گی ——— چاند چودھویں منزل پر پہونچ کر سدا گھٹتا ہی
رہے گا۔ آکاش پر کبھی اندھیارے کی حکومت ہوگی کبھی اُجیالے کی۔ پر چاند تو اپنی
راہوں پر چلتا ہی رہے گا ——— کون جانے یہ دکھی چاند بے چارا ———
چاند اور راجو کا یہ لامتناہی سلسلہ جانے کب ختم ہوگا ——— ؟

ماضی ——— اور ——— مستقبل

آئے تھے اور یہ نہیں کہ یونہی آئے ہوں پہلے تو مصاحبین خاص میں داخل ہوگئے اس کے بعد بابر کی فوج میں سالار اعظم کی جگہ پر فائز ہوئے اور پھر انکی اولاد اکبر کے دربار میں پنج ہزاری"۔۔۔۔۔ یہ کہتے ہوئے نسیم نے حاضرین کے چہرے پر فاتحانہ انداز سے دیکھا۔۔۔۔۔ "میاں ایسے ویسے نہیں۔۔۔۔ کوئی لونڈی بچے تھوڑا ہی ہیں اس لکھنؤ میں کسی کی مجال ہے کہ آنکھ تو اُٹھا کر دیکھ لے۔" کہنے کو تو نسیم یہ سب کچھ کہہ گیا لیکن فوراً ہی اس کے دل میں ایک نامعلوم سی کیفیت پیدا ہوئی وہ تھوڑی دیر تک تو سمجھ بھی نہ سکا آخر یہ کون سی طاقت تھی جو اس کو اس طرح رنجیدہ کردیتی ہے بالخصوص اسوقت جبکہ وہ اپنے دوستوں میں بیٹھ کر اپنے آبا و اجداد کے کارناموں کا ذکر کرتا "پدرم سلطاں بود" اس نے دل ہی دل میں کہا اور پھر ایسا محسوس کیا کہ جیسے اس کہاوت کا دوسرا حصہ اس کے ذہن میں تکرار رہا ہو۔ وہ اُسے بھولنا چاہتا تھا اس نے گردن کو یکبارگی جھٹکا دیا، جیسے سر سے کوئی بھاری بوجھ اُتار رہا ہو۔ نہیں اس سے کیا ہوتا ہے یہ ایک بدیہی حقیقت ہے۔ جس کو کوئی بھی جھٹلا نہیں سکتا۔ سچ مچ اس کے خاندان کا ماضی کتنا شاندار تھا۔ کاش وہ اسکی ایک جھلک ہی دیکھ سکتا۔ لیکن تصور تو کیا ہی جا سکتا ہے۔ کسی کے دماغ پر کسی کا کیا اختیار۔ اس غلامی کے زمانے میں بھی ہماری فکریں ذہنی طور پر آزاد ہیں ہم جو چاہیں سوچیں کون منع کرسکتا ہے، کس کی مجال ہے جو ہمارے خیالات پر پہرا بٹھائے۔۔۔۔ لیکن انکی عملی تشکیل پردۂ فکر سے پردۂ حقیقت پر ناممکن ہے۔ نسیم کا دماغ اسوقت بہت تیزی سے کام کر رہا تھا، وہ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے اس کو کوئی بلا رہا ہے

باہر نوکر کھڑا کہہ رہا ہے "سرکار آپ کو بڑی بیگم صاحبہ یاد فرماتی ہیں" ——
"اونہہ" —— وہ جھنجھلا گیا۔ "مجھے کون اس طرح بلائے گا جیسے کوئی میں نواب زادہ ہوں، لیکن نہیں نوابزادہ تو ہوں ہی —— خاندانی نواب —— کوئی معمولی آدمی تھوڑا ہی ہوں —— اوہ" وہ کتنی دیر سے گم سُم بیٹھا تھا اُس نے دوبارہ حاضرین کی طرف دیکھا، ابھی خاصی خاموشی تھی۔ اُس نے پھر سلسلہ کلام جاری کیا۔

"کیوں صاحب کیا خیال ہے۔ میں مانتا ہوں کہ اس بیسویں صدی میں نسلی تفاخر کی کوئی اہمیت نہیں لوگ پدرم سلطان بود کے قائل نہیں رہے۔ زندگی میں عہد حاضر کی زیادہ وقعت ہے لیکن اگر واقعی گزری تاریخ کی اپنی کوئی انفرادیت ہے تو کیا وجہ ہے کہ خاندانی شرافت —— آباؤ اجداد کی سلطانی میرے لئے باعث فخر نہ ہو"۔

کسی نے بھی اس کی تردید نہ کی۔ وہ اس کی وجہ بھی کیا ہو سکتی تھی وہاں تو ہر ایک نواب تھا۔ اگر خود نواب نہیں ہر ایک کا خاندانی شجرہ کسی نہ کسی نواب سے تو ضرور ہی ٹکراتا تھا۔ لیکن نسیم کو وہاں خاموش ہی ہونا پڑا جب اُس نے دیکھا کہ محمود نے فوراً ہی تڑپ کر کہا۔

"دیکھو میاں نسیم —— بہت لن ترانیاں اچھی نہیں ہوتیں اتنی سی بات پر ریشہ خطمی ہو گئے۔ تمھارے یہاں کوئی اکبر کے دربار میں پنج ہزاری تھے تو بھائی میں تو اسی اکبر کی نسل سے ہوں چنگیزی خون میری رگوں میں دوڑ رہا ہے —— محمود تو ابھی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن احباب کے ایک فرشی قہقہے نے اس آگ پر ایسا پانی ڈالا کہ ہر ایک اپنے حسب نسب کو تھوڑی دیر کے لئے بھول گیا۔

"اچھا تو یہ کہئے کہ ان کے پڑدادا آپ کے پڑدادا کے دربار میں پنج ہزاری تھے۔" اس پر تو قہقہہ کا ایک اور دونگڑا پڑگیا۔

دیر تک ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ نسیم تو بظاہر اس ہنسی میں شریک تھا۔ مگر دل میں کڑھ رہا تھا۔ اس نے غلطی سے بے موقع بات کی، لیکن اس میں موقع ہی کی کیا بات تھی ـــــ کاش کہ وہ نواب ہوتا ـــــ نواب کیا اگر تعلقدار بھی ہوتا تو بھی غنیمت تھا پھر کس کی مجال تھی کہ مسکرا بھی دیتا ـــــ اتنے میں کسی نے ایک تجویز پیش کی جس کو سُن کر حاضرین پھڑک اُٹھے۔

"ارے بھائی چھوڑو بھی یہ فسانے چلو سینما چلیں" ـــــ ہر طرف سے تائید کی آوازیں آنے لگیں۔

"ارے میاں کوئی اچھی فلم بھی ہے کہ یونہی" فہیم نے کچھ سوچکر ذرا سی دیر میں کہا۔

"واہ بھائی فہیم صاحب واہ ـــــ ارے بھائی ایک نہیں چار پانچ فلمیں آئی ہوئی ہیں مگر ہم لوگ تو "پکار" دیکھنے چلیں گے"۔ رشید نے "پکار" پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "پکار" کا نام سنتے ہی کمرے میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔

نسیم بھی اس تجویز پر داد دئے بغیر نہ رہ سکا "واہ رے میرے شیر کیا بات کہی کتنی مرتبہ دیکھا مگر طبیعت نہیں بھرتی ضرور دیکھیں گے"۔

"مان لیا بھائی مان لیا" فہیم نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔

آخر میں یہ طے ہوا کہ یہ فلم ضرور دیکھی جائے گی اور ابھی جائیں گے کہیں ایسا نہ ہو کہ آج آخری ہی دن ہو۔

"میاں ایسی فلم کہیں روز روز آتی ہے" رشید نے کہا "اور پھر یہ بھی کہ پرانی

تصویر ہے خدا جانے اب آئے یا نہ آئے۔"

"یہ سچ مچ جی چاہتا ہے کہ ہر وقت دیکھتا ہی رہے" فہیم نے سانس چھوڑ کر کہا۔

"تسیم نے بھی کمال کر دیا ہے" یہاں تو حبیب سے بھی نہ رہا گیا۔

"ارے میاں یہ نسیم نہیں تم کس غلط فہمی میں پڑ گئے، مس تسیم ہیں مس تسیم" رشید نے تسیم کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھا اس پر حاضرین میں ایک قہقہہ اور بلند ہوا۔

بالآخر سب لوگ ہنستے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"بھئی یہیں سے یکہ پر بیٹھ کر چلیں گے" محمود بولا "جاؤ میاں فہیم ذرا لپک کر یکہ لیتے آؤ۔ مگر ذرا گھوڑے دوڑے کو دیکھ لینا لیکن ایک یکہ سے کام بھی تو نہ چلیگا۔ ہم لوگ پانچ آدمی ہیں ایک یکہ تو پولیس کے پھندے میں پھنسا دیگا اور پھر پہنچے گا بھی نہ جانے کب۔"

"خیر تو یکے بھی آجائیں گے لیکن ابھی بہت وقت ہے ذرا [illegible] ذرا جب تیرے پہلے نورجہاں کی گرم چاندنی" کا تو لطف" اٹھاؤ آسمان سے" اتر کر زمین پر فرش ہو رہی ہے کیوں بھئی محمود تمہارا کیا خیال ہے۔"

"اچھا تو آپ کے نزدیک دھوپ اور چاندنی میں فرق نہیں" قمر سے بھی نہ رہا گیا۔

غرض "ہوادار" یکے آگئے اور مساوات تقسیم کے بعد ہر شخص اپنی سواری پر قابض ہوگیا اور یکے چل پڑے ——— کسی راہگیر نے آواز لگائی "بہت تیزی دوڑ رہی ہے ——— لدگئی نہ آج اکوں پر ——— اُدھر چنگیزی یکہ بڑھ گیا اور تیموری پیچھے رہ گیا ———

"کیوں بھائی یکے والے یار چلاؤ ذرا تیزی سے دیکھیں تمہاری چال۔"

"حضور شام ہو گئی تھان پر پہنچنے ... بھرکا تھا ... ———

چاہا پلے تو دہداری دکھائے ـــــ ہمارے بڑے تو جب بیٹن پر چلتے تھے تو کبھار پہلے ہی سوتنے کے توائے نگل لیتے تھے یہاں تو نہ دانا ہے نہ پانی ـــــ چل بیٹا ٹخ ٹخ ـــــ پھر بھلا کیا چال دکھائے۔" تسیم نے یکے والے کی بات سے ویسے تو کوئی دلچسپی نہیں لی لیکن وہ اسکی باتوں پر برابر ہنستا رہا وہ چاہتا تھا کہ یکے والا برابر بولتا رہے اسکی باتوں میں ایک عجیب سی کیفیت تھی۔

"تو پھر پورا راتب کیوں نہیں دیتے"

"حضور روپے دو روپے میں کیا خود کھائیں کیا جانور کو کھلائیں پھر بال بچے کا ساتھ اور مہنگی بھی تو بلا کی ہے کیوں حضور یہ لڑائی کب ختم ہوگی یہ سالا جرمن تو ایسا جٹا ہے کہ ہٹنے کا نام نہیں لیتا۔ پھر سرکار سننے میں آیا ہے کہ اب اگاڑی پچھاڑی پر نظر ہے ـــــ یہ اونٹ سرکار نہ جانے کس کروٹ بیٹھے گا۔"

"واہ بھائی واہ ـــــ سنا رشید اس کو بھی سیاست کی ہوا لگ گئی، بھئی یہ سیاست تو کہیں بھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔"

"اسے میاں تم کو اپنے یکے گھوڑے سے کام ـــــ لڑائی بھی ہوتی ہی رہیگی۔"

اس نے ایک عجیب سا منہ بنایا "تو صاحب کیا کبھی ختم نہ ہوگی۔ آج کتنے برس ہوگئے جب ہم نے پچھلی گھوڑی خریدی تھی سو روپیہ میں غفور کے ہات بیچ دی اب اس کے پاس ہے مگر سالا چار سو چہرہ شاہی مانگتا ہے یہاں اتنا پیسہ کہاں ـــــ مگر سرکار دوڑتی خوب ہے۔ اڈے پر بس غفور کا ڈنکا بجتا ہے وہ تو ایسی گھوڑی تھی کہ مجبوراً میں نے بیچ دی، پانی کے مول گئی سرکار ـــــ شادی کرنی تھی ـــــ وہ بھی ایک نہیں دو ـــــ پھر بیچتے نہ تو کیا کرتے اس میں تو ہاتھوں سے

نکل گئی سرکار ہیں تو سر پیٹ کے رہ گیا۔ اب ہوتی سرکار، تو نہ جانے کتنے کا آدمی ہوتا ____ خیر پرواہ نہیں چل بیٹا ____ چل" ____ یکہ والا بڑبڑاتا چلا جارہا تھا کوئی سنے یا نہ سنے۔

اچانک ایک دفتر کے پاس وہ پہنچ کر رک گیا۔

" حضور ذرا ٹھہرئے میں ابھی آیا ____ اپنے روپیہ لے لوں۔"

"ارے میاں واپسی میں لے لینا ____ کیسے روپے ہیں" نسیم نے دریافت کیا۔

"ایسے ہی سرکار ____ ذرا لگام تھامے رہئے بس دو منٹ میں آیا ذخیرہ لینا ہے سالے بابو لوگ روز تنگ کرے ہیں۔ آج نہیں کل، کل نہیں پرسوں۔"

نسیم چونک پڑا یکے والا دوڑ کر بارادری میں گھس گیا۔

"کیوں کیا بات ہے" رشید نے پوچھا

"میاں یہ بھی کوئی گڑبڑ تو معلوم ہوتا ہے۔"

" ہوگا یہ بھی کوئی سنکی والا"

"آنے دو پوچھیں گے کہ کس باغ کا کانٹا ہے"

اتنے میں یکے والا دوڑتا ہوا آیا۔ چہرے سے غصہ ظاہر ہو رہا تھا آتے ہی محسن نے لگام پکڑی ____

"چل بیٹا ہرن کی چال ____ جلدی سے ____ چلا نہیں جاتا۔ نیم کھائی ہے کیا نشے میں ہے" یہ کہہ کر اُس نے سڑاک سڑاک چابک کس کر دی۔ گھوڑا دولتی جھاڑتا ہوا بھاگ نکلا ____"

"کیوں بھائی یکہ والے، لے آئے ذخیرہ۔

"نہیں حضور، یہ سالا محکمہ کہیں آسانی سے تھوڑا ہی دے گا۔ ارے صاحب بڑے بڑے چرکٹے بابو ہیں اب ہوگیا تو بڑے دفتر بند ہو رہا ہے کل آنا جب دیکھو ہی، صبح کو جاؤ تو بولتے ہیں کہ ابھی دفتر ٹھیک سے نہیں کھلا فلانے بابو نہیں آئے۔ یہاں سواری بیٹھی ہے کتنا ہی کہو ____ حضور سرکار ہم کو جلدی دے دو ہمارے بال بچے بھوکے مرتے ہیں مگر وہاں تو وہی مرغے کی ایک ٹانگ ____ کل بارہ بجے آؤ" ____ یہ کہہ کر اس نے ایک موٹی سی گالی سنائی۔ رشید نسیم اور حبیب کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

"کس نواب سے تعلق رکھتے ہو"

"معلوم نہیں سرکار ____ اللہ ہی جانے کس چرکٹے نواب کے پوتے پڑپوتے ہونگے یہاں گھر میں کھانے کو نہیں، ہوگا کوئی"

نسیم نے دل میں سوچا کہ عجیب آدمی ہے اپنے آباؤ اجداد کو گالی دیتا ہے ویسے تو اصلی النسل معلوم ہوتا ہے بیوقوف مُردوں کو گالیاں دیتا ہے وہ لوگ جنکی عظمت میں کبھی بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا ____ اپنی قسمت کو دوش نہیں دیتا۔ واقعی ہمارا ماضی کتنا شاندار تھا لیکن آج ہم لوگ اس قعر ذلت میں پڑے ہیں کوئی پرسان حال نہیں ہے ایک اودھ ہی کیا تمام اسلامی ممالک کا یہ حال ہے ایک زمانہ تھا کہ ہم میں خالد بن ولید تھے ____ اس نے اپنے جسم میں ایک تھرتھری سی محسوس کی۔ یکایک چونک کر دیکھا جیسے خواب دیکھتے دیکھتے آدمی جاگ جائے اور پھر اُس خواب خیال کی چیز کو حقیقت کی دنیا میں تلاش کرنے لگے۔

"حبیب! کیوں بھائی تم نے اسلامی تاریخ بھی پڑھی ہے"

نسیم خاموش ہو چکا تھا۔ سامنے نشاط ٹاکیز ہے جہاں "پکار" ہو رہا ہے۔

"بھیا! اٹھو کتنی دیر ہو گئی کیا سوتے ہی رہو گے دیکھو یہ کون آئی ہیں سارے گھر میں آگ لگے کا سا شور ہو رہا ہے اور آپ ہیں کہ کروٹ نہیں بدلتے۔

نسیم چونک پڑا "بیوقوف کہیں کی۔ اتنے تڑکے اُٹھا دیا۔ میں کس مزے کا خواب دیکھ رہا تھا"۔ لیکن طلعت کو دیکھ کر وہ جھینپ سا گیا "اچھا آپ کب آئیں"۔

"آج سویرے ہی آئی ہوں آپ مزے سے پڑے سو رہے تھے"۔ طلعت نسیم کی پھوپھی زاد بہن تھی جسکو آج اس نے تقریباً چار سال بعد دیکھا تھا لیکن اس کو دیکھ کر وہ فوراً پہچان گیا کیونکہ اس کے آنے کی امید بھی تھی اور پھر گھر میں بھی اکثر و بیشتر اسکا ذکر ہوتا رہتا تھا۔

"کیا خواب دیکھ رہے تھے۔ نسیم بھائی ہم بھی تو سُنیں صبح کا مبارک خواب"۔

"خواب واب کچھ نہیں ایسے ہی رات "پکار" فلم دیکھ کر آیا تھا تو بس وہی جہانگیر اور مغلیہ زمانے کی عظمت میری آنکھوں میں پھر رہی تھی۔

"اوہو ــــ آپ تو اس مزے سے بھی واقف ہیں"۔

"خیر اس کو چھوڑیے اس زمانہ کو یاد کرنا ہی فضول ہے۔ کیونکہ وہ آ نہیں سکتا وہ کارواں کوچ کر چکا ہے جرس بج چکے ہیں جس کی آواز بہت غور و خوض کے بعد سنائی بھی دیتی ہے تو وہ بھی ہلکی ہلکی ــــ نقش پا ہیں وہ بھی دھندلے دھندلے، لے دیکر تاریخ ہی ایک سہارا رہ گئی تھی ورنہ سچ پوچھئے تو یہ ماضی کی یادیں قریب قریب

ختم ہو چکی ہیں وہ تو خدا بھلا کرے مورخوں کا جو یہ ہم تک پہنچ گئیں ہیں"———
نسیم بولتا جارہا تھا۔ گویا اپنے گردوپیش کو بھول چکا تھا۔ کون بیٹھا ہے کون نہیں ——— وہ خاموشی سے سر جھکائے تھوڑی دیر تک بیٹھا رہا کمرے میں ایک عجیب سی اُداسی چھائی ہوئی تھی جیسے کوئی دھیمے دھیمے ساز بجا رہا ہو۔ نسیم کی نظریں سامنے والی شاہجہاں کی تصویر پر پڑیں۔ کتنی اداس معلوم ہو رہی ہر باوجودکہ وہ شجاعت اور جوانمردی کا ایک پیکر تھی لیکن فنکار نے اسکی آنکھوں میں برش سے ایسا رنگ پھیرا تھا کہ اُداسی کی ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ تکبر کی تمکنت اداسی میں جذب ہوگئی تھی"۔ چنگیز اور تیمور کی اولاد" نسیم نے اپنی نظر تصویر سے ہٹالی۔

"آج ہم آپ کے یہاں آئے ہیں" ہمیں کیا دکھائیے گا" طلعت نے نسیم سے کہا۔

"کیوں نہیں آج کل تو بھیا کی چھٹیاں ہیں ورنہ ہی تو تفریح کرتے ہیں" نسیمہ بشاش سے بولی۔

"اچھا تو پھر آج عجائب گھر نہ دیکھنے چلیں۔ یہاں کے عجائب گھر کی بڑی شہرت سنی ہے"۔

"نہیں عجائب گھر دیکھ کر کیا کروگی۔ اگر لکھنؤ دیکھنا چاہتی ہو تو امام باڑے دیکھو نگارخانہ (پکچر گیلری) دیکھو۔ یہی تو لکھنؤ کی عظمت جھلکتی ہے چلو پکچر گیلری ہی کو آج کے پروگرام میں شامل کریں ——— سچ پکچر گیلری بھی لکھنؤ کا پورا ماضی ایک کمرے میں سجا ہوا ہے گویا تاریخ کے ورق کھلے ہوئے ہیں ———
کتنے بادشاہ ایک کمرے میں ——— [illegible]

اقلیم میں نہیں رہ سکتے لیکن اگر وہ آج لکھنؤ کی پکچر گیلری دیکھتے تو پھر یہ نہ کہتے۔"

تسنیم یہ کہہ ہی رہا تھا کہ اماں کمرے میں داخل ہوئیں۔" ادہو بھیا سے باتیں ہو رہی ہیں۔ تسنیم کل میں نے کہا تھا کہ اچھی خبر ہے کل صبح سے میری آنکھ پھڑک رہی تھی۔ میں کہوں کیا خوشخبری سنوں گی لیکن لونڈیا بڑی ماند ہو گئی دیکھتے نہیں کیسی کھپاٹ ہو رہی ہے موے کا سامنہ نکل آیا ہے۔"

طلعت کو ہنسی سی آئی وہ کتنی تندرست ہو رہی تھی مگر نانی اماں کو ہمیشہ دُبلی ہی دکھائی دیتی ہے اس نے بمشکل تمام اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا " نہیں نانی اماں میں تو اچھی خاصی موٹی تازی ہوں۔"

" موٹی کیا ہے خاک ـــــــ مُردار پہلی کا چاند۔"

" اب تو کسی سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی تینوں کھل کھلا کے ہنس پڑے۔ پھر اماں کو کہاں تاب ـــــــ

" ان لونڈی لاروں سے میں عاجز آ گئی ہوں۔ بات منہ سے نکلی نہیں کہ بتیسی باہر دن بھر کھی کھی ـــــ" یہ کہہ کر اماں چلدیں اور پھر سنجیدگی سے پُرانے مسئلے پر گفتگو شروع ہو گئی جس کے بعد یہ طے ہوا کہ آج پکچر گیلری چلیں گے۔

الغرض شام کو چائے پی کر سب پکچر گیلری روانہ ہو گئے احاطے کے اندر داخل ہوئے تو سامنے ایک عمارت نظر آئی۔ یہی وہ عمارت ہے جہاں لکھنؤ کی عظمت، لکھنؤ کی شجاعت، لکھنؤ کی سخاوت، لکھنؤ کی رنگینی اور لکھنؤ کی نفاست نظر بند ہیں اندر قدم رکھتے ہی تسنیم کی آنکھیں نمناک ہو گئیں وہ اندر بڑھتا چلا گیا اور آصف الدولہ کی تصویر تک پہنچ گیا۔

"یہ تھی لکھنؤ کی دولت طلعت! یہ دیکھو وہی نواب ہیں جن کے متعلق مشہور ہے کہ جس کو نہ دے مولا اسکو دے آصف الدولہ" طلعت اور نسیمہ تصویر کو غور سے دیکھنے کے لئے آگے بڑھیں "دیکھیں ہم بھی، انھیں کیوں بھیا۔ امام باڑہ انھوں نے بنایا تھا کیا" نسیمہ نے پوچھا۔

"ہاں یہ لکھنؤ کا شاہجہاں ہے تم نے اکثر سنا بھی ہوگا" نسیم نے پُر جوش طریقہ سے کہا۔

ٹہلتے ٹہلتے وہ تینوں اس تصویر تک پہنچے جس پر پردہ پڑا تھا ——— "اس پر پردہ کیوں پڑا ہے نسیم بھائی یہ کس کی تصویر ہے" طلعت نے دریافت کیا۔

"اس کو مت دیکھو یہ تمھارے دیکھنے کی نہیں" نسیم نے ہنستے ہوئے کہا "اس کے متعلق بڑی بڑی باتیں مشہور ہیں یہ واجد علی شاہ کی تصویر ہے سنتے ہیں کہ اس کو دیکھ کر کوئی صاحبزادی بے ہوش ہو گئی تھیں اس سے اس پر پردہ ڈال دیا گیا۔

"آپ تو ایسے بتا رہے ہیں جیسے کوئی [illegible] قیامت [illegible] اور پوچھنا [illegible] کہہ گئی وہ جھینپ سی گئی وہ ہنسنا چاہتی تھی مگر یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے اس کے قہقہہ کو روک دیا ہو وہ مسکرا کر رہ گئی۔

سب لوگ ہنستے ہوئے سیڑھیوں سے اترے وہ سوچ رہی تھی [illegible] کتنا عجیب ہے اور مستقبل اس سے زیادہ ——— [illegible] ہو سکتی ہے۔ کیا باتیں ہیں تھوڑی دیر کے لئے مسحور کر دیتی ہے۔ نسیم طلعت اور نسیمہ پھر امام باڑے دیکھتے ہوئے واپس ہوئے ——— گھر آتے وقت راستہ سے

متعلق گفتگو ہوتی رہی طلعت نے تبسم کو تاج محل کی ایک بہت خوبصورت تصویر تحفتہً پیش کی ـــــ سچ ہے کہ یہ طبقہ اسی مردہ پرستی پر زندہ ہے جہاں تحفہ تحائف بھی قبروں کی تصویروں کے دیے جاتے ہیں۔ اس کمرے میں ایک ہمایوں کے مقبرے کی تصویر بھی آویزاں تھی۔ متوسط طبقہ کا ماضی "تاج محل" اور ہمایوں کا مقبرہ ہے خوبصورت مرمر کی شاندار قبریں ـــــــــ

سب لوگ بیٹھے تاج محل دیکھ رہے ہیں حقیقتوں کی بستیوں اور خیالات کی حسین وادی سے ماوراء انکے دماغ پرواز کر رہے تھے فلک کی رفعتیں زمین کی پہنائیوں سے آکر مل گئی تھیں ـــــ تاج خاموش تھا ـــــ شہنشاہوں کے مقبرے سنسان تھے لیکن اُن کی شاہانہ عظمت ماحول پر اثر انداز ہو رہی تھی، صدیوں کے بعد تاج گویا اپنا خراج وصول کر رہا تھا اور اسکا کلس گویا شفاف چاندنی میں بہتے ہوئے دریا کی روانی سے کہہ رہا تھا ـــــ "تم بڑھتے چلے جاؤ زندگی ارتقا کا نام ہے اور ارتقا زندگی کی تفسیر ـــــ تم جہاں سے شروع ہوئے تھے وہاں کا راستہ سورج کی شعاعوں سے بھی زیادہ باریک تھا لیکن تم بڑھتے رہے اور آج تمھاری لہریں میرے پاؤں چھو رہی ہیں ـــــ لیکن رکو مت بڑھے جاؤ یہ مقبرے کی دیواریں شاہ جہاں کی بے جان لاش کو پناہ دے سکتی ہیں ـــــ اس میں اس سے زیادہ وسعت نہیں ـــــ تم کو تو آگے بڑھنا ہے ـــــ بڑھے جاؤ اس لئے کہ ایک وسیع سمندر تمھارا انتظار کر رہا ہے اسلئے کائنات کی پہنائیاں تمھیں آگے بڑھ کر ساحل کی قیود سے آزاد کر دیگی مڑ کر پیچھے مت دیکھو اس لئے کہ تمھارا ماضی پہلی کے چاند سے زیادہ باریک اور سورج کی شعاعوں سے ۔

زیادہ تنگ ہے ـــــ تم اپنے حال سے مت گھبراؤ ـــــ ساحلوں کی تنگدامانی کا شکوہ مت کرو اس لئے کہ یہ ساحل منزل نہیں ہے منزل تو دور بہت دور ہے ـــــ ابھی تمھیں تڑپتے ہوئے، مچلتے ہوئے، اچھلتے ہوئے چلنا ہے ـــ منزل پہنچ کر تو پھر سب مل کر ایک ہوجائیں گے۔ وہ دیکھو افق کے پاس سمندر کی پہنائیاں اپنی آغوش تمھارے لئے وا کئے ہے لیکن نہ جانے نسیم تاج کے کلس کے پیغام کو سن بھی سکا یا نہیں ـــــ وہ جمنا کی لہروں کی طرح اپنا سر شاہجہاں کی ہڈیوں سے ٹکراتا ہی رہا ـــــ اس کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ ایک نہ ختم ہونے والا خواب دیکھ رہا ہے۔ لیکن کسی آواز سے خوابوں کا یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔

"بیٹا ذرا بازار سے دو روپیہ کا آٹا لا دینا گھر میں غلہ نہیں شام ہوگئی کل کہیں گیہوں سے گا۔"

"کتنا غیر شاعرانہ کام ہے" نسیم نے دل ہی دل میں سوچا مگر کچھ بھی نہ کہہ سکا مجبور تھا کیونکہ طلعت گھر میں آئی ہوئی تھی پھر اس نے اس کے سامنے ہی صاف انکار کی گنجائش بھی نہ تھی اور اگر کچھ بھی کرتا تو شام کو فاقہ کرنا پڑتا نسیم کو مجبوراً خاموش ہوجانا پڑا اس نے تیرہ آنے جیب میں ڈال دیا بازار میں پہنچا تو اس کی نظر چکاچوند خوب صورت دوکانوں پر پڑتی تھی بعد وہ دزدیدہ نظروں سے چھوٹی موٹی گندی دوکانوں کی طرف دیکھ رہا تھا وہ ابھی تو ٹھیک سے بازار میں داخل بھی نہ ہوا تھا کہ بنیوں کی دوکانیں سامنے آگئیں کتنی دوکانیں ہیں دو روپیہ کا آٹا خریدنا ہے کس طرف جائے اس وقت تاج محل کی شکل اس کی آنکھ سے اوجھل ہو چکی تھیں بنیوں کی بڑی بڑی توندیں ـــــ گالوں کے بل ـــــ

وہ ایک دکان میں گھس ہی تو گیا ــ

"آٹے کا کیا بھاؤ ہے"

"آٹا نہیں ہے سرکار تو بھاؤ تاؤ کیا بتائیں"

"زندگی میں کم مواقع آتے ہیں ـــــ وہ یہ جواب سن کر گھبرا گیا خیر اگلی سہی مگر وہاں بھی یہ جواب ـــــ انھیں پر کیا منحصر بارہ تیرہ دکانیں دیکھنے کے بعد تب کہیں ایک بنئے نے ایک روپیہ کا دو سیر بتایا۔ نسیم چونک پڑا ـــــ ایک روپیہ کا دو سیر ـــــ ہاں جنگ کی وجہ سے ہوگا نہ جانے یہ جنگ کب ختم ہوگی۔ آج چار پانچ سال تو ہوگئے وہ آٹا لیکر گھر کی طرف چل دیا پہلے چیزیں کتنی سستی تھیں اماں بتاتی ہیں کہ انکے زمانے میں گھی سوا سیر کا ملا کرتا تھا اس کی پریشانی کچھ کم ہوگئی تھی ماضی کی یادیں کتنی لطیف ہوتی ہیں ـــــ نسیم آٹے کی پوٹلی لئے ہوئے چلا جا رہا تھا انھیں خیالات میں غلطاں دپیچاں ـــــ ماضی کی وادیوں میں غوطے لگاتا جو آج دن کے سورج سے بھی زیادہ چمکدار نظر آرہا تھا۔ اسکے خیالات کا تسلسل گانے کی آواز سے ٹوٹ گیا کوئی راہ گیر گاتا چلا جا رہا تھا۔

زمانے کا دن رات ہے یہ اشارا　　کہ ہے آشتی میں مری یا گذارا

نہیں پیروی جن کو میری گوارا　　مجھے ان سے کرنا پڑے گا کنارا

سدا ایک ہی رخ نہیں ناؤ چلتی

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

نسیم کو جیسے کسی نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ایک راہگیر کی الاپ نے

اُسے ماضی کی گود سے اُٹھا کر حال کے سامنے پھینک دیا اور اُس نے مضبوطی سے پوٹلی پکڑ کر گھر کی طرف قدم بڑھائے۔ سورج ڈوبنے سے پہلے پہنچ جائے تو اچھا ہے ورنہ کھانا دیر سے ملے گا اور پھر گھر میں مہمان بھی تو ہے ——— طلعت بھی انتظار کر رہی ہوگی بے چاری ——— اور طلعت کی سیاہ آنکھیں اور بھورے بھورے بال اس پر اپنا سایہ ڈالنے لگے۔

مستقبل

شریف یکہ ہانکتا گومتی کنارے چلا جا رہا تھا۔ صبح سے یہ وقت آگیا۔ دن بھر کی تھکن اُس کے دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ ٹمک ٹمک کی ہلکی ہلکی آوازیں اس کی زبان سے نکل کر فضا میں بہہ رہی تھیں۔ ندی کی ہلکی پھلکی لہریں سینہ پھُلائے چلی جا رہی تھیں۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ بھی اُداس ہیں۔ یونہی چلی جا رہی ہیں۔ انھیں اپنی منزل مقصود پر کسی نہ کسی طرح پہنچنا ہے۔ یہ لہریں بھی اسکو اپنی ہی طرح معلوم ہو رہی تھیں ——— مجبور ——— بے بس۔ جیسے اُن کا بھی کوئی آقا ہے۔ ان پر بھی کوئی جبر کرتا ہے۔ کتنی مجبور ہیں یہ لہریں پھُولی پھُولی شفق کا عکس پانی میں پڑ رہا تھا۔ لیکن وہ لہریں انھیں کیا دلچسپی اس حسن سے فطرت کے ان حسین مناظر سے۔ اس وقت یہ لہریں کتنی خاموشی سے چلی جا رہی

تھیں۔ آہستہ آہستہ جیسے کوئی روئی کے گالوں پر چلتا ہو۔ شریف نے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ وہ اس منظر کو دیکھے گا۔ اپنی اداسی، اپنی پریشانی، اپنی دماغی اُلجھن گومتی کے ان لہروں کے سپرد کردے گا۔ لے جاؤ ـــــ بہادو ان کو سمندر کے اس بے پایاں حصہ میں جس کی سطح پر پہنچے۔ بہتے ہیں تاکہ وہ ان کو فنا کردیں اور وہ پھر لوٹ کر نہ آسکیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے واقعی اُس کی اُداسی ختم ہو رہی تھی۔ اس کے سینے میں خوشی اُمڈ رہی تھی۔ مُسکراہٹیں ابھر رہی تھیں وہ یکہ کے ڈنڈے پر سر ٹیک کر شفق کی سرخیوں میں کھو گیا اور نہ جانے کتنی دیر کن کن خیالات میں ڈوبا رہا ـــــ چوک کی حسین جوانیوں کی آغوش اگر اس کے لئے وا نہیں تو کیا ـــــ گومتی کی حسین فطرت کی باہیں تو اس کو دعوت نظارہ دے رہی ہیں۔ یکایک ایک آواز نے چونکا دیا۔

"اکے والے ذرا چوک چلو گے؟" وہ چونک پڑا۔ جیسے کسی نے سوتے سے اٹھا دیا ہو۔

"نہیں سرکار۔ اب گھوڑا کھولنے کا وقت ہے۔" وہ پھر شریف نے شعوری طور پر ٹِک ٹِک کی اور چابک دیا۔ وہی پہیوں کی گڑگڑاہٹ وہی ٹِک ٹِک، وہی تاریک ماضی کی بھیانک اور پریشان کن یادیں شریف نے زور سے گھوڑا بڑھایا یکہ اس تیزی سے جا رہا تھا جیسے کوئی تعاقب کر رہا ہو۔ اس کا ماضی کتنا تاریک تھا جہاں روشنی کی ایک کرن تک کا گزر نہ تھا۔ ایسی زندگی موت سے بھی بدتر تھی ـــــ پھر وہ کیوں جی رہا ہے۔ مستقبل کی آس میں؟ وہ ماضی سے ناامید ہو گیا تو کیا مستقبل تو اپنا ہے۔ وہ دن بھر یکے کی ذہنی اُلجھن سے تنگ آچکا ہے۔ وہ اپنے ننھے منے بچوں کی دلچسپ باتیں نہیں سن سکتا۔ سوچ کی

تمازت برداشت کرتا ہے۔ برسات کی مسلسل جھڑی میں یکہ لئے پھرتا ہے۔ پھر بھی وہ نا اُمید نہیں۔ وہ اپنی کشتی مستقبل کے سہارے کھے رہا تھا۔ حالانکہ اسکی کشتی بھنور میں پھنسی ہوئی تھی اور اس سے پہلے بھی بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کر چکی تھی جنکے تھپیڑوں سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اگر اس کو اس بھنور سے نکلنے کی امید نہ ہوتی تو شاید وہ چپو چھوڑ دیتا، پر اس کو یقین تھا کہ آنے والے دنوں میں ہر چیز اسکی اپنی ہوگی۔ بکا ہوا شیرا واپس آ جائے گا۔ اُس نے غلطی کی جو شیرا کو بیچ دیا۔ اس کے بہن بھائی اس پر جان چھڑکتے تھے۔ اس کو پیار کرتے تھے۔ اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کو گھاس کھلایا کرتے تھے۔ کتنا روئے تھے سب کے سب جب وہ شیرا کو تھان سے کھول کرلے جا رہا تھا۔ اور منّی تو کئی دن گھر سے باہر نہیں نکلی۔ ہر وقت پڑی رویا کی۔ ان سب کو شیرا سے بے انتہا محبت تھی بالکل ایسی ہی جیسے گھر والوں میں ہوتی ہے۔ آخر وہ بھی گھر ہی کا ایک فرد تھا۔ جب کوئی کھانے پینے کی چیز آتی تو شیرا کا حصہ الگ لگتا۔ "آخر اس میں بھی تو جان ہے" اس کی ماں کس پیار سے کہتی اور سب بچے دوڑتے "لاؤ اماں شیرا کو میں اپنے ہاتھ سے دونگا۔ اور شیرا خواہ کتنا ہی کھائے کیوں نہ ہوتا پھر بھی اس تحفہ کو قبول کرنے میں تامل نہ کرتا جھٹ بھاڑ سا منہ پھیلا دیتا۔ جب شریف اس کو بیچ کر آیا تو تھوڑی دیر تو کوئی بھی اس سے نہ بولا۔ ہر ایک روٹھا رہا۔ وہ خود بھی کس قدر رنجیدہ تھا۔ ایسا جی چاہ رہا تھا کہ خوب دہاڑیں مار مار کر روئے۔ پھر اُس نے خود ہی کہا "اماں جب میں نے شیرا کو تھان پر باندھا تو اُسکی آنکھوں میں آنسو آگئے"۔ یہ سنتے ہی بچے اس کے گرد جمع ہو گئے۔

"تو بھیا تم نے چمکارا کیوں نہیں؟"

"کیوں بھیا اُس نے رسّی تو نہیں توڑی؟"

"توڑی ضرور ہوگی۔ اچھلا کودا ہوگا۔" منّی نے رونی صورت بنا کر کہا۔

"بھیا بڑے بُرے ہیں۔" منے نے کہا۔

"دیکھو تو ـــــ انھوں نے ہمارے شیرو کو بیچ دیا۔ ان کا کیا گیا۔" منّی بولی۔

"ان کا کیا جاتا ـــــ ان کو تو روپئے مل گئے۔" منے نے چڑھاتے ہوئے کہا۔

صرف اس کی ماں اور بڑی بہن خاموش تھیں۔ لیکن ان کی صورت سے بھی ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سب سے زیادہ وہی پریشان ہیں۔ چھوٹی بہن کی افسردہ صورت دیکھ کر تو وہ پاگل سا ہوگیا تھا۔ اس کے بیاہ کی وجہ سے تو اسے یہ سب کرنا پڑا تھا۔ اگر گھوڑا نہ بیچتا تو بیاہ کیسے ہوتا۔ اور پھر اس کے بیاہ کا بھی تو سوال تھا۔ ساس سسر کتنے دن سے پریشان کر رہے تھے ـــــ وہ پھر سے گھوڑا آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ گندی باتیں ایک ایک کر کے اس کے ذہن میں گھسنے لگیں۔

ہنھ ـــــ اس نے گردن جھٹکی۔ آخر یہ اس کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتیں۔ اس نے گھوڑے کو پھر تیزی سے دوڑایا ـــــ وہی ٹھک ٹھک ـــــ وہی پہیوں کی گڑگڑاہٹ وہی ماضی کی ہولناک اور پریشان کن یادیں پھر ان کو بھلانے کے لئے اس نے جیب سے روپیہ نکالے۔ آج کی آمدنی دس روپئے کچھ آنے۔ اس میں کل ڈیڑھ روپیہ اس کی سارے دن کی محنت ہے۔ ڈیڑھ روپیہ میں کہیں گذر ہوتا ہے۔ اور اس مہنگائی میں کون سی چیز سستی ہے۔ چلو اس کنٹرول سے یہ تو ہوا کہ کچھ سستا ملنے لگا۔ نہیں تو یہ بنئے ـــــ یہ خود تو اور مہنگا بیچتے ہیں۔ کئی بار اس

نے بابوجی سے دو روپیہ روز کرنے کو کہا مگر وہ کہاں مانتے ہیں۔ اُلٹا روز اُسی پر بگڑتے ہیں۔ اب آج ہی دس روپے چھ آنے لے کر جا رہا ہوں مگر بھلا جو چھوٹے منہ سے کہہ دیں کہ شاباش آج لائے ہو ــــــ تو چار پیسے تماکو کے، روز یہی کہتے ہیں کہ کیا تجھے دیں اور کیا گھوڑے کو کھلائیں۔ ابے گھوڑا ذرا سا تھوڑا ہی کھاتا ہے۔ تجھے کھلانا پڑے تو دال آٹے کا بھاؤ معلوم ہو جاوے" ہنھ ــــــ جیسے وہ سدا ایسا ہی تو تھا۔ اُس نے کبھی گھوڑے تھوڑا ہی پالے تھے۔ جیسے وہ جانتا ہی نہیں۔ اسے ــــــ حد سے حد دو روپیہ۔ وہ بھی جب ٹھکانے کا راتب ہو۔ یہ بیچارے کیا کھلائیں گے ــــــ مکھی چوس۔ اس کو غصہ آنے لگا۔ پر وہ دانت پیس کر رہ گیا۔ جب اُس نے نوکری کی تھی تو سوچا تھا کہ روپیہ خرچ کرے گا اور اٹھنی بچائے گا۔ اور اس طرح وہ جلد ہی شیرا کو خریدے گا۔ لیکن آج تک وہ یک پیسہ بھی پس انداز نہ کر سکا۔ آخر اتنے بڑے کنبے کا خرچ ہے۔ اور وہ اکیلا کمانے والا۔ یہ لڑائی بھی تو ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ جیسے گذر ہوتی ہے اسی کا کلیجہ جانتا ہے ــــــ بابوجی کا بنگلہ آچکا تھا، اس نے یکہ روکا اور منیم جی کے پاس جا کر روپیہ گنتے لگا اتنے میں سیٹھ جی بھی بدبی چڑھی توند جھُلاتے آگئے۔

"کیوں بے ــــــ آج کتنا لایا؟"

"سرکار۔ دس روپے چھ آنے" شریف نے تیزی سے فخریہ انداز میں کہا۔ جیسے آج اُس نے کمال ہی تو کر دیا۔ لیکن فوراً ہی سیٹھ جی کی صورت دیکھ کر پژمردہ ہو گیا۔

"بس ــــــ کل دس روپیہ چھ آنے۔ آج تو اتوار کا دن تھا ــــــ اچھا منیم جی! دیدو یک روپیہ۔ اٹھنی کاٹ لینا، کل ملے گی" انھوں نے کہا اور

بیڑی کا دھواں اڑاتے ہوئے چل دیے۔

شریف چاہتا تھا کہ آج کسی طرح دو روپیہ وصول ہو جائیں اور اُلٹے یہاں اٹھنّی گرہ سے کٹ گئی اور روز سے تو دو روپیہ زیادہ ہی لایا تھا۔ اگر وہ چپکے سے اسی میں سے اٹھنّی صاف کر دیتا تو ان کے باپ کو بھی پتہ نہ چلتا ——— پر ایمانداری کا زمانہ نہیں، شریف کی امیدوں پر پانی پھر گیا اور وہ سر جھکائے چل دیا ——— وہ پھر انھیں خیالات میں کھو گیا۔ جنھوں نے اس کی زندگی کا شیرازہ بکھیر دیا تھا۔ اُس نے بھولنے کے لئے رتّو کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ اُسے کوئی ایسی دیر تو نہیں ہوئی۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا، پھر بھی تھوڑی بہت روشنی تھی۔ چراغ جلے تک وہ گھر پہنچ جائے گا۔ رتّو دروازہ پر بیٹھی اس کی راہ تک رہی ہوگی۔ وہ اس کو دیکھ کر کیسا مسکراتی ہے۔ یہ سوچ کر اس نے اپنے جسم میں ایک پھریری سی محسوس کی۔ اس نے اپنی رفتار تیز کی اور دبی لے میں گانا شروع کیا "تو کون سی بدلی میں میرے چاند ہے آجا" اور اسی مصرعہ کو دیر تک جھوم جھوم کر گاتا رہا۔ اس کی آواز میں بڑا جوش تھا، خوشی تھی جیسے وہ چاند جو ابھی بدلی میں چھپا ہے اس کے اس طرح گانے سے نکل ہی تو آئے گا جیسے اندھیرا ہوتے ہوتے اُجالا ہونے لگے۔ جب شریف گھر پہنچا تو رتّو [illegible] ڈیوڑھی میں اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ شریف کو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اُس نے اپنے [illegible] سے [illegible] کی ترتیب [illegible] کھڑی تھی۔

اٹھنّی ——— جا تجھے [illegible]۔

کہیں بھی تو نہیں ——— [illegible] جواب دیا۔

"جا دیکھ تو ــــــ میں نے ابھی سنا ہے ذرا سی لونڈیا پر زبان کیسی کترنی سی چلتی ہے" ربّو بڑبڑائی اور منّی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی اندر چلی گئی۔ اتنے میں شریف ربّو کے بالکل قریب آگیا۔

"آج تو بڑے مزے ہیں" شریف نے موقع غنیمت جان کر "پیش دستی" کرتے ہوئے کہا۔

"کیا مزے ہیں ــــ" وہ تنک کر پیچھے ہٹ گئی۔

"منّی کو اندر کیوں بھیج دیا"

"ایسے ہی ــــ تم سے مطلب" وہ جھینپ سی گئی۔ جیسے چوری پکڑی گئی۔

"اور یہ قمیص کے بٹن تو لگا۔ اتنی بڑی ہوگئی پر تمیز نام کو نہیں دیکھ تو سب کھلا ہوا ہے"

"کھلا رہنے دو بیاہیوں کے لیسے ہی ہوتا ہے۔ کوئی کنواری تھوڑا ہی ہوں"

پھر اس کو خیال آیا کہ اس نے غلط جواب دیا اور فوراً ہی اپنی مدافعت دوسری طرح کی "بٹن تو لا کر نہیں دیتے، ہر وقت یہی کہتے رہتے ہیں یہ کھلا ہے، وہ کھلا ہے۔ تمھیں بُرا لگے تو اپنی آنکھیں بند کر لو" ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ٹرکایتاً کہہ رہی تھی پر صورت بتا رہی تھی کہ اُسے ذرہ برابر بٹن نہ ہونے کا رنج نہیں۔ اُس نے پھر کہنا شروع کیا " تم بھی اماں کی طرح لگائے رہتے ہو۔ وہ بھی میری مصیبت کئے رہتے ہیں۔ اب گلا کھلا ہے، اب دوپٹہ سینے پر نہیں، اب بیچارہ اوپر کو سرک گیا۔ جوان لڑکی کسی چیز کا ہوش نہیں" وہ یہ کہتی جا رہی تھی اور مڑ مڑ کر دیکھتی جاتی تھی۔ اُس نے شریف کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگی "سچ سچ تمھارے مکان میں یہ بڑی خرابی ہے کہ کوئی بات کرنے کی

کر رو ہی تو دیں گے۔ لیکن فوراً ہی شریف نے کہا۔

"نہیں آئے گا کیسے نہیں، شیرا کو میں خود لاؤں گا۔"

شریف پھر اداس ہو گیا، کیا اُس کی یہ پریشانیاں کبھی ختم نہ ہونگی۔ چند روز سے اس کی یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ جب کہیں اڈے پر بھی تنہا ہوتا، پریشانیوں کا ہجوم اس کو گھیر لیتا تو وہ ربّو کے خیال سے اپنے کو بہلایا کرتا۔ وہ اپنی تمام پریشانیوں کو اس کے خیال میں تحلیل کر دیتا۔ گویا کائنات کے تمام رنج و غم ربّو کے وجود سے الگ تھے۔ لیکن اس وقت ربّو کا وجود بھی اس کے لئے بار ہو رہا تھا۔

اتنے میں ماں بول اُٹھی اور اُس نے اس خاموشی کو توڑا۔

"بیٹا ـــــ منھ، ہاتھ دھولے کھانا تیار ہے۔ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی شریف کی نظر ربّو کے کھلے ہوئے سینے پر پڑی۔ پھر اُس نے دیکھا کہ وہ رُو رہی ہے اور اس نے ربّو کو بہلانے کیلئے چھیڑنا چاہا ـــــ

"اری روپٹہ تو ڈال لیا کر۔ دیکھتی نہیں قمیص کھلی ہے۔"

اس مرتبہ ربّو نے جواب دئے بغیر دوپٹہ سرکا کر ٹھیک سے اوڑھ لیا۔ اور دوسری طرف منہ پھیر کر آنسو پونچھنے لگی۔ شریف پریشان ہو گیا ـــــ

اگلے روز شریف حسب معمول امین الدولہ پارک کے سامنے یکہ لئے کھڑا تھا۔ کھڑے کھڑے دو گھنٹے گذر گئے بُھنی تک نہیں ہوئی۔ نہ جانے کیسا منحوس دن ہے۔ وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا اتنے میں ایک لڑکی اس کی طرف آتی نظر آئی۔ شریف نے یکہ بڑھایا ـــــ

"کہیے مس صاحب یکہ چاہیے ———"

فوراً ہی ایک تانگہ والا للکارا۔ "اے مس صاحب یکہ میں جائیں گی۔ آیئے ادھر آیئے۔" اس نے گدی جھاڑتے ہوئے کہا۔ "تانگہ حاضر ہے ——— کہاں جانا ہے۔"

شریف کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ کوئی کالج کی لڑکی معلوم ہوتی ہے بھلا کالج کی لڑکی اور یکہ میں بیٹھے۔ لیکن اس لڑکی نے فوراً کہا۔ "تانگہ نہیں چاہیے۔ یکہ میں جانا ہے۔" شریف کا دل بلیوں اچھل پڑا کتنے دن بعد آج ایک لڑکی اس کے یکہ پر بیٹھ رہی ہے۔ اس نے دیکھا کہ گدی کتنی گندی ہے ادھر سواریوں کے کہنے پر تو وہ ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا "حضور ابھی تو بدلی ہے" لیکن اس وقت جھاڑتے ہوئے اس نے کہا۔

"بیٹھیے مس صاحب، پر افسوس ہے گدی بہت میلی ہو رہی ہے۔"

"کوئی ہرج نہیں ——— خاصی صاف تو ہے۔" وہ جواب دیتے ہوئے بیٹھ گئی۔ ایک تھیلا اس کے ہاتھ میں تھا اور کھدر کی ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ شریف کچھ ایسا گھبرایا کہ اس نے کرایہ تک نہیں طے کیا۔ وہ چپ رہا۔

"کہیے مس صاحب۔ کالج سے چلوں؟"

"نہیں ——— بنارسی باغ۔"

"آپ کالج میں نہیں پڑھتیں۔"

"میں نے پچھلے سال پڑھنا چھوڑ دیا اور اب مزدوروں و کسانوں کی پارٹی میں کام کرتی ہوں۔"

مزدوروں اور کسانوں کی پارٹی ہیں شریف نے دل ہی دل میں سوچا۔ اس سے پہلے بھی اس نے اس کا ذکر سنا ہے اور ان کے لال جھنڈے والے جلوس بھی دیکھے ہیں۔

"وہی لال جھنڈے والی پارٹی نا ــــــ دیوی جی" اس نے پوچھا۔

"ہاں ــــــ وہی ــــــ"

"تو آپ اس میں جلوس نکالتی ہیں ــــــ بہت سے آدمی ہوں گے آپ کی پارٹی میں"

"ہاں ــــــ بہت سے آدمی ہیں۔ آج کل ہم ہندو مسلمانوں کے میل جول کے سلسلہ میں کام کر رہے ہیں۔ جنتا کو بتا رہے ہیں، جنتا سمجھتے ہو نا"

"جی ہاں۔ جی ہاں۔ لوگوں کو ــــــ"

"ہاں تو ہم لوگوں کو بتاتے ہیں کہ ہندو مسلمانوں کے ایک ہونے سے کیا فائدہ ہوگا۔

"کیا فائدہ ہوگا ــــــ" شریف نے جھٹ پوچھا۔

"بھائی ــــــ تم نے ضرور سنا ہوگا کہ گاندھی جی اور جناح صاحب بات چیت کر رہے ہیں۔ ہندو مسلمانوں کی صلح کی لئے اور اگر وہ صلح کر لیتے ہیں تو جانتے ہو کیا ہوگا"

"کیا ہوگا" شریف نے بے چینی سے دریافت کیا۔

"ہندستان آزاد ہو جائے گا"

"ہائیں ــــــ ہندستان آزاد ہو جائے گا" شریف نے حیرت سے کہا اور

نوابی ختم ہو گئی۔ وہ تو اتنا جانتا ہے کہ اُس کا باپ جب مرا تو اتنا بھی نہ تھا کہ ٹھیک سے دفنا بھی سکتے۔ بس کسی نہ کسی طرح نماز پڑھاکر دفنا دیا اور بڑے دادا بھی تو بُری طرح مرے تھے۔ ابا جانتے تھے کہ علاج کرانے کو بھی پیسے نہ تھے ہم غریبوں کی مرکر بھی مصیبت ہے جیتے جی تو خیر ہے ہی۔ کہیں ڈیڑھ روپیہ روز میں گزر ہوتی ہے۔ اتنے آدمی ہیں بنئے کا قرض الگ سے بڑھتا جاتا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے۔ اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا حال کی پریشانیوں نے آکر اس کو پھر دبوچ لیا۔ وہ پاگل ہو جائیگا مگر پھر اس کو یاد آیا پریشانی کی کونسی بات ہے۔ اُیدنے ڈھارس دی۔ دو چار روز کی اور بات ہے سچ مچ اب تو مزے آجائیںگے بس صلح کی دیر ہے۔ اس کے دل و دماغ میں پھر شگفتگی آگئی' وہ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اتنے میں گھر سامنے آگیا۔ اس نے دروازہ پر پہنچ کر یکہ روکا۔ یکہ کی آواز سنتے ہی بچے دوڑ پڑے" بھیا آگئے ـــــ بھیا آگئے۔ ہمیں بھی گھما لاؤ بھیا ـــ" سب یک وقت چیخ پڑے۔ شریف کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ان کے شور سے خیالات اس کے دماغ میں گڈ مڈ ہو گئے۔ اس کو غصہ آنے لگا۔ وہ تو کتنی اچھی خبر لایا ہے اور یہاں آتے ہی بچے پریشان کرنے لگے اور پھر بغیر پوچھے ہی یکہ پر چڑھنے لگے۔

"اترو اس پر سے!" شریف نے زور سے ڈانٹا۔

اتنے میں رجّو بھی دوپٹہ سنبھالتی ہوئی آگئی۔

"کیوں ڈانٹتے ہو بیچاروں کو ـــ اگر ان کا شیرا ہوتا تو کیا......"

شریف نے فوراً رجّو کی بات کاٹ دی ـــــ

"شیرا آجائے گا تُجھے اچھیں پڑے ـــــــ" اماں شیرا آرہا ہے۔ بھیا کہتے ہیں، "شیرا آرہا ہے" سب چلّاتے ہوئے اندر بھاگے ربّو کے سینے سے دوپٹہ ڈھلک گیا جیسے اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہو۔ شریف کی نظر اس کے گلے پہ پڑی "اری یہ تُمنے ٹانکے کیوں دئے" اس نے جلدی سے ہات بڑھا کر گریبان کے ٹانکے توڑ دئے۔

"ہائے اللہ ـــــــ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔ میں نہیں جانتی" اس نے روتی صورت بنا کر کہا۔ "میں کہتی ہوں گھر میں تم ہی اکیلے تو ہو نہیں جو ایسے ہی کھولے پھروں۔ اماں دیکھیں گی تو کیا کہیں گی۔ وہ ویسے ہی دن بھر چلّاتی رہتی ہیں کہ بہو بیٹیوں کے یہ ڈھنگ نا ہوتے" بس ذرا دوپٹہ سرکا اور انھوں نے للکارا "ونڈی لاڈوں کے دن آگئے اور تیرا یہ الھڑپن نہیں گیا" اس مارے تو میں آپ دن بھر اوڑھے بیڑے پڑی رہتی ہوں۔"

"ربو" شریف نے ٹہلتے ہوئے کہا "بس دیکھ میں تیرے لئے ململ کا کرتا لاؤں گا۔ کرتا نہیں جمپر ٹھیک رہے گا۔ پھر تو میری رانی "میم" معلوم ہوگی میم۔"

"تو کیا سچ مچ سب چیزیں سستی ہوجائیں گی" ربو نے اپنے آپ کو ریشمیں جمپر میں ملبوس محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"تو کیا میں مذاق کر رہا ہوں۔ بس تو دیکھتی رہ۔ ہر چیز یوں بکے گی یوں" شریف نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا "کوڑیوں کے بھاؤ پھر تو میں تیرے لیے بہت سی چیزیں لاؤں گا۔ سچ مچ اپنی ربو کے لئے تو جان تک حاضر ہے"

"پھر وہی بات" ربو کو بس اسی بات پر غصہ آیا تھا "جان حاضر ہے"

یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ نہ جانے کس کی سنگت میں رہ رہ کر ایسی بڑی بڑی باتیں سیکھتے ہو۔

اتنے میں اماں بھی آگئیں "بیٹا ــــ کیا بات ہے۔ یہ بچے کہہ رہے ہیں کہ بھیا شیرا کو لانے والے ہیں" انکے پیچھے پیچھے بچے بھی چلے آ رہے تھے۔

"پوچھ لو نا ــــ بھیلے" منی نے کہا۔

"ہاں اماں ــــ گاندھی جی اور جناح صاحب میں صلح ہو رہی ہے۔ اب ہندو مسلمان ایک ہو جائیں گے۔ پھر ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔ اور ہر چیز سستی ہو جائے گی"

"بیٹا ــــ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کبھی ہندو مسلمان ایک ہوئے بھی ہیں جو اب ہی ہو جائیں گے"

"نہیں اماں ــــ صلح ضرور ہو جائے گی۔ تم دیکھتی تو رہو"

"ہاں ــــ ہاں۔ ہم تو بہت دیکھ چکے۔ دیکھتے دیکھتے تو چونڈا سفید ہو گیا۔ اب تم ہی دیکھو"

"اماں ــــ تم کیا جانو۔ میرے مدرسے میں آج ایک لڑکی آئی تھی وہ بڑی [illegible] تھی۔ وہ کھدر کی ساڑی پہنے تھی" اس نے کھدر پر خاص طور سے زور دیا "اور وہ لال جھنڈے والی پارٹی میں کام کرتی ہے"

اماں کچھ قائل ہوتی نظر آئیں۔ "کسی طرح بیٹا یہ صلح ختم ہو جائے پھر کیا ہے۔ اب تو جان مصیبت میں آ گئی ہے"

کئی دن گزر گئے شریف کو کچھ نہ معلوم ہو سکا کہ ہندوستان کب آزاد ہو رہا ہے

وہ اکثر یہ سوچ کر گھبرا جاتا ہے کہ جب ان لوگوں کو معلوم ہے کہ ان کی صلح سے ملک آزاد ہو جائے گا۔ مہنگی ختم ہو جائے گی۔ جنتا بھوکی نہ مرے گی تو پھر یہ دیر کیوں وہ قوم کو بھوک اور غلامی سے چھڑانا چاہتے ہیں۔ پھر وہ سوچنے لگتا۔ بھلا اس میں اتنی لمبی چوڑی بات چیت کرنے کی کیا ضرورت؟ جب بھی وہ کسی کو اس قسم کی بات کرتے دیکھتا تو وہ خاموشی سے بڑے غور سے سنتا رہتا۔ اس نے دیکھا کہ قریب قریب ہر ایک ہی تو یہی کہتا کہ صلح ہو جائے گی۔ گاندھی جی نے پاکستان مان لیا۔ پھر کیا جھگڑا ہے۔ آج کتنے دن بیت گئے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کیا ہوگا جس سے بھی پوچھو یہی بتاتا ہے کہ ابھی بات چیت ہو رہی ہے۔ ہر ایک کہہ رہا ہے کہ جناح صاحب نے بار بار کتوبر کو کہا تھا۔ اگر ہم صلح نہ کر سکے تو یہ سمجھو کہ ہماری نقل کا دیوالہ نکل چکا ہے اور گاندھی جی نے بھی کہا ہے کہ ہمارے ملک کے دکھیوں کی آنکھیں ہماری طرف لگی ہوئی ہیں۔ ہم ہر ممکن کوشش کریں گے کہ صلح ہو جائے ـــــ شریف یہ باتیں سن کر اطمینان کا سانس لیتا۔ مگر یہ حالت تھی کہ جیسے ہی وہ پہنچتا بچہ بچہ اس سے پوچھتا " بھیا! صلح ہوئی یا نہیں" اس کا ناک میں دم آگیا تھا جب وہ کہتا۔

" بھائی جب ہوگی میں آپ بتا دوں گا۔ ابھی کچھ پتہ نہیں" تو ان کے پھول سے چہرے کمہلا جاتے۔ پھر بھی وہ سب کو یقین دلاتا رہتا کہ صلح ضرور ہو جائے گی ـــــ اسی طرح دن گزرتے رہے ـــــ

۲۸ اکتوبر کی شام کو شریف حسب معمول یکہ ہانکتا چلا جا رہا تھا۔ دماغ ـــــ ماضی، حال اور مستقبل کے جالوں میں الجھا ہوا تھا۔ یکایک ایک آواز نے اسکو

سکتا۔ اس کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس کا دماغ پھٹ جائے گا پھر اس کو خیال آیا کہ بابو جی کہتے تھے کہ "پھر میں گے"۔ ممکن ہے سمجھ میں آجائے کوئی بیوقوف تھوڑا ہی ہیں ——— غلطی ایک مرتبہ ہوتی ہے آخر آدمی ہی تو ہیں ———

پھر دہی بینک روڈ آگئی۔ لہراتی بل کھاتی ہوئی گومتی ——— ڈوبتے ہوئے سورج کا جھلملاتا ہوا عکس۔ شفق کی سرخی کے درمیان سورج کھویا ہوا تھا۔ تاریکی بڑھتی جا رہی تھی ——— سورج کی مدھم روشنی۔ شفق کی سُرخی۔ نرم نرم گلے ——— ہانپتی کانپتی لہریں ناگن کی طرح بل کھاتی چلی جا رہی تھیں ——— شفق کے سہارے اور یہ ہلکی ہلکی روشنی بھی کتنی دیر؟ آکاش کی کجلاہٹ بڑھتی جا رہی ہے' اور سرخی بھی انھیں لہروں میں غرق ہو رہی تھی اور اس نے اپنا سر تکیے کے ڈنڈے سے ٹکا دیا۔ جیسے رات کے اندھیارے کے آگے سر جھکا دیا ہو اور بابو صاحب ہلکے ہلکے گنگنا رہے تھے ؎

رات ہو تارے ہوں آنسو ہوں مجھے کیا ان سے
میں سمجھتا ہوں کہ سورج نہ رکے گا اُن سے

پلکوں میں آنسو

"کر کھٹال جاتا ہوگا اس سیاسی کام میں"۔ تو اس نے ضبط کرنے کی کوشش کی مگر کھل سے ہنسی آ گئی —— یہ بھی کوئی گورنمنٹ کی نوکری ہوئی۔ نازو جو اندر سے ہنسی تو وہ سنجیدہ ہوگیا بلکہ اپنے مسکرانے پر کچھ جھینپ سا گیا۔ اس نے اس سوال کو ٹالتے ہوئے پانی مانگا۔

"اچھا تو پھر تو مدت سے نہیں؟"

"نہیں چچی ذرا طبیعت خراب تھی"۔

"خیر تو پھر اس طرح [illegible] صبح صبح نہیں پیتے —— نازو ذرا ادھر سے باورچی خانہ میں چلی جا بھیا کے لئے کچھ ناشتہ پکا دے پردہ کا ہے کا اپنا ہی تو بھائی ہے"۔

پھر تو نازو خوش ہوگئی۔ اس وقت امی کا نازو کہنا بھی اس کو نا گوار نہ گزرا اس نے فوراً دوپٹہ سنبھالا [illegible] جانب سے باورچی خانہ میں چلی گئی۔ شمیم نے شرما کر سر جھکا لیا امی نے پھر کہنا شروع کیا۔

"یہ لڑکی ایسی شرمیلی ہے۔ اپنوں تک سے تو پردہ کرتی ہے۔ کوئی اپنوں سے بھی چھپتا ہے"۔ اسکو ہنسی آ گئی یہ امی بھی بس خوب ہی آدمی ہیں، خود ہی تو پردہ کراتی ہیں [illegible] کہتی ہیں [illegible] نے ہی تو خود کالج چھوڑا تھا جیسے —— اس کے غصے کا پارہ پھر بڑھنا شروع ہو۔ اچھی بھلی کالج جا رہی تھی لیکن چھڑوا دیا۔ "سیانی لڑکیوں کا کالج جانا ٹھیک نہیں، بے بس بہت پڑھ چکی"۔ ان کے لئے تو اس سے زیادہ بس اور کوئی پڑھائی نہیں۔ سیانی کی بھی بس ایک [illegible] پڑھانے کے تو بہانے ہیں۔ آخر اتنی لڑکیاں پڑھتی ہیں کوئی سیانی ہی نہیں، لے دے کر دہی ایک سیانی رہ گئی ہے جس کا پڑھنا ٹھیک نہیں۔ وہ آنو چھپاتی جا رہی تھی اور دل ہی دل میں امی پر ناراض ہو رہی تھی، اس کے ساتھ کی لڑکیاں سب ہی تو پڑھتی ہیں علیہ

آلو کاٹ رہے اور اس کے بعد جلدی جلدی انڈے کا حلوہ تیار کرنے لگی۔

ذرا سی دیر میں تمام ناشتہ تیار ہوگیا۔ اس نے ٹرے میں باقاعدہ لگایا اور امی کو کو آواز دی" امی ناشتہ تیار ہوگیا لے جائیے"

امی باورچی خانے میں آگئیں" بیٹی تو خود ہی لے آئی ہوتی" انھوں نے آہستہ سے کہا۔

"تم نے خود ہی تو پردہ کے لئے کہا تھا اور اب یہ کہہ رہی ہو"

"ارے میں نے یہ تھوڑا ہی کہا تھا کہ تو ایسا پردہ کرنے لگ۔ ذرا منہ ڈھک کے سامنے آجا اپنے گھر کے کام کاج میں بھی ہرج نہ ہو۔ پھر یہ تو بھیا نسیم کا لڑکا ہے اتنے دن بعد یہاں آیا ہے، تو اسے نہیں جانتی یہ تو اپنے گھر کا لڑکا ہے" امی ٹرے لیکر چل دیں اور وہاں پہنچ کر بولیں" ناز و بیٹا تو بھی کچھ کھالے، تو نے نہیں کھایا صبح سے۔ آجا یہاں بھیا کے پاس"

اور پھر شمیم سے بولیں" اس کا جی اچھا نہیں تھا، میں نے آج روزہ نہیں رکھنے دیا اسے"

اس وقت ناز و کتنی بچاتی ہوئی دوسری چارپائی پر ماں کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ سر جھکائے ہوئے تھی مگر اس کا چہرہ کیسا لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ کہاں تو وہ غور سے بات سن رہی تھی اور اب یہ تک بھول گئی کہ کہاں بیٹھی ہے، وہ چارپائی کے دو ٹوٹے بانوں کو غیر شعوری طور پر جوڑنے لگی اس کو کتنی شرم آئی جب اس کے سر کے بال آپ ہی آپ کھسک گئے اس کو غصہ تو بہت آیا۔ منحوس وقت بھی تو نہیں دیکھتے جب نہیں تب بکھر پڑتے ہیں اور لانے بھی تو بلا کے ہیں مگر اس نے بھی انھیں،

یہ سزا دی کہ دیر تک ایسے ہی تکنے دیا۔ اس نے کنکھیوں سے دیکھا شمیم شاید اسی کی
طرف دیکھ رہا تھا تو پھر اس نے گھبرا کر انھیں اوپر ڈال دیا۔ لیکن وہ تو رکنے کا نام
نہ لیتے تھے۔ بمشکل تمام کئی جھٹکے کھا کر تھمے۔

تھوڑی دیر تک تو وہاں بالکل خاموشی رہی لیکن بعد شمیم نے خود اس سکوت کو توڑا۔

"یہ کیا کرتی ہیں"

"نازو" امی چونک پڑیں" ہاں بیٹے یہ اسکول میں پڑھتی تھی، اس سال میں نے
پڑھنا چھڑا دیا ہے، اب سیانی ہو گئی ہیں نے سوچا کہ اس عمر میں اسکول کالج جانا
ٹھیک نہیں زمانہ بڑا خراب ہے پھر اتنا پڑھ لیا اب کیا ضرورت ہے شمیم تو خاموش
ہو گیا۔ لیکن نازو کی جھنجھلاہٹ بڑھ چکی تھی اور اب اس کو پھر امی پر غصہ آنے لگا۔
اچھا قصہ لے کر بیٹھ گئیں۔

نازو چونک پڑی یہ تھی اس [illegible]
جھجک تھی، ایک شرم تھی جو آہستہ آہستہ یہ سکوت [illegible]
آرزوئیں پروان نہ چڑھ سکیں گی۔ لیکن وہ [illegible]
اس نازو کے کھینے سے [illegible]
شانوں پر وہ سر رکھ کر روتی [illegible]
شمیم کو معلوم ہے کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ [illegible]
لیکن نہیں [illegible] معلوم [illegible]
[illegible]
ہو جائے گی۔ [illegible]

جاگتے گزر گئیں وہ رات کی تاریکی میں دیوانوں کی طرح دوڑتی ہے، گرتی ہے ــــ اس اندھیرے میں اس کا سانس گھٹ رہا ہے ــــ روشنی کی تلاش۔

وہ آئینہ کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی اس نے صبح سے اپنے بال تک نہیں بنائے تھے۔ الجھے ہوئے تھے اس نے سنوارنا شروع کر دیا۔ اس کا دماغ بیکار ہو گیا تھا وہ کنگھا کئے جا رہی تھی جو آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں رینگ رہا تھا وہ سلجھ بھی گئے تھے مگر نازو کا ہاتھ برابر چل رہا تھا اس کی آنکھیں ہر چند کھلی ہوئی تھیں مگر اُسے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ شمیم کا وجود اس کی زندگی کو بنا سکتا تھا۔ اس میں لطافت پیدا کر سکتا تھا، کاش وہ اس کے پاس ہوتا ــــ وہ یکایک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہی۔ شمیم آئینہ میں اس کے پاس کھڑا ہے۔ اس کی زلفوں سے کھیل رہا ہے۔ جتنا بھی وہ غور سے دیکھتی شمیم کی شکل اتنا ہی صاف نظر آتی یہ آئینہ کتنا صاف ہے کہیں دھبا تک نہیں اس نے دیکھا کہ جیسے شمیم نے اس کا سر اپنی طرف جھکایا ہو، نوجوان نصرت کے ابدی اور نہ معدوم ہونے والے نقوش ثبت کرنے کے لئے اس کا سر ایک طرف کو جھک گیا۔ نازو چونک پڑی وہاں کوئی بھی تو نہ تھا اس نے غور سے دیکھا ایک میلا آئینہ اُس کے سامنے تھا جس میں اُس کا عکس دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ وہ تنہا تھی، ابھی اس میں اُس نے شمیم کو دیکھا کتنے صاف اور واضح نقوش تھے۔ لیکن یہ آئینہ کتنا گندا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اس کی گرد کو کسی نے جھاڑا تک نہیں، شمیم کو اس نے ابھی دیکھا تھا۔ اسی آئینہ میں اپنی داہنی طرف "شمیم" اس نے آہستہ سے کہا، "لو یہ میری پیشانی ہے۔ اس پر اپنی محبت کے نقوش ثبت کر دو۔" وہ چونک پڑی آخر کس سے بات کر رہی ہے۔

ان کے کہنے سے کیا ہوتا ہے ہر وقت تو لال لال کتابیں لئے پھرتے ہیں۔ خونی رنگ کی کتابیں، بھلا یہ بھی کوئی رنگ ہے اُسے اس رنگ سے اُلجھن ہونے لگتی اسے نفرت ہوگئی ہے اس سرخی سے ــــــ اس لالی سے۔

وہ انھیں خیالات میں کھوئی ہوئی تھی کہ یکایک شمیم نے دروازہ کھولا۔ "تم کمرہ میں کیوں اتنی دیر سے بند پڑی ہو، کچھ معلوم بھی ہے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، قائداعظم محمد علی جناح اور مہاتما گاندھی ادھر باہم سمجھوتہ کرنے کے سلسلے میں ایک دوسرے سے گفت و شنید کر رہے ہیں اور ادھر برطانیہ کے وزیراعظم مسٹر چرچل سے امریکہ کے صدر مسٹر روزویلٹ کیوبک میں ہندستان کی آزادی کے سلسلے میں مل رہے ہیں اور تیسری طرف جرمنی میں فاشزم کا خاتمہ ہو رہا ہے ــــ دیکھا تم نے ــــ

لو سرخ سویرا آتا ہے، آزادی کا آزادی کا
گلنار ترانے گاتا ہے، آزادی کا آزادی کا
دیکھو پرچم لہراتا ہے، آزادی کا، آزادی کا
لو سُرخ سویرا آتا ہے، آزادی کا، آزادی کا
لو سُرخ سویرا آتا ہے، آزادی کا، آزادی کا
لو سُرخ سویرا آتا ہے، آزادی کا آزادی کا

شمیم اس مصرع کو جھوم جھوم کر گا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے واقعی سرخ سویرا آ رہا ہے، جیسے اس کی محنتوں کا پھل بہت جلد ملنے والا ہے صبح آزادی کی شفق اس کی نظروں میں ناچ رہی تھی۔ اس نے تھیلے سے ایک کتاب نکالی جس پر "سرخ سویرا" لکھا ہوا تھا ــــ

لو نازو! یہ کتاب میں تمھیں بطور تحفہ پیش کرتا ہوں۔ امید ہے کہ تم اس کو شوق سے پڑھوگی ——"

"کیوں نہیں" —— نازو نے اس کو اپنے ہاتھ میں بے دلی سے لے لیا۔ اس کی پژمردگی ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ گھبرائی ہوئی نظروں سے شمیم کی جانب دیکھ رہی تھی۔ جیسے کوئی پاگل کی طرف دیکھتا ہے، پھر اس نے کتاب کی طرف دیکھا —— سرخ رنگ —— شفقی رنگ —— ایک مزدور اپنے قوی ہاتھوں سے مشین کا پہیہ چلا رہا تھا۔ وہ جھنجھلا گئی اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ شمیم متحیر تھا کہ نازو اس قدر پریشان کیوں ہے —— "نازو تمھاری طبیعت کیسی ہے؟"

"کچھ نہیں —— اچھی تو ہوں" اس کے گالوں کی سرخی پہلے سے زیادہ گہری ہوگئی تھی۔ شمیم نے ہنستے ہوئے اس کو آئینے کے سامنے کر دیا۔

اس کے رخسار دو انگار ہو رہے تھے، جیسے ساری کائنات لال ہو جائے گی، گالوں کا گلنار رنگ دیکھ کر اس نے چہرے کو ہاتھوں سے چھپا لیا —— منحوس کہیں کے ——

"کیوں تمھیں یہ کتاب پسند ہے؟" شمیم نے خوش ہو کر کہا۔

"جی ہاں بہت اچھی ہے"

"بہت اچھی، یہ بھی ایک تیز چیز ہے، تم نے ضرور پڑھا ہے ——" نازو جھینپ گئی، وہ بھی کتنی بے وقوف ہے۔ بغیر سوچے سمجھے جو جی میں آتا ہے بک جاتی ہے۔

"نہیں میرا مطلب اس کی ظاہری شکل و صورت سے تھا" اس نے بات

کو نباہ دیا" اچھا آئیے ناشتہ تو کر لیجیے۔"

"واہ میں ناشتہ تو کب کا کر چکا' جب تم کمرے میں عبادت کر رہی تھیں۔" شمیم کی زبان سے بے ساختہ "عبادت" کا لفظ یونہی نکل گیا لیکن نازو جھینپ سی گئی۔ یہ بھی ایک قسم کی عبادت ہی ہے۔

"اچھا تو آپ دیر کے آئے ہوئے ہیں۔"

"مجھے تو کافی دیر ہو گئی۔ تمھارے متعلق امی سے کئی مرتبہ پوچھا مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ پھر میں نے کہا کہ کہیں کچھ طبیعت تو خراب نہیں۔ انھوں نے کہا کہ تو خود جا کر دیکھ لے شاید پچھلے کمرہ میں ہے۔"

"ہاں یونہی ذرا طبیعت گھبرائی تھی تو یہاں چلی آئی ویسے تو میری طبیعت ٹھیک ہے۔"

نازو کی آنکھوں میں مسرت کی ایک لہر سی دوڑ گئی، اس نے گھنی پلکوں میں سے اس طرح دیکھا کہ کوئی چیز ان میں سے جھانک رہی ہے۔ کیا واقعی شمیم اس سے محبت کرتا ہے۔ کیا سچ مچ اسے نازو کا اتنا خیال ہے وہ شاید اس سے بھی زیادہ سوچتی لیکن شمیم کی موجودگی حائل ہو گئی۔ اس وقت اس کا دماغ کوئی کام نہیں کر رہا تھا۔ کتنی دیر سے وہ یہاں کھڑی تھی اسے یہ بھی خیال نہ تھا کہ اس کے بال کھلے ہوئے ہیں' یونہی اس نے محسوس کیا' ذرا جھینپ سی گئی۔ لیکن کیا یہ بال اس کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہے ہیں' واقعی وہ بہت خوبصورت معلوم ہو رہی ہوگی۔ اس نے غیر شعوری طور پر بالوں کی ایک لٹ کو اپنی انگلیوں میں لپیٹنا شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ

اپنے ماحول کو بھول چکی تھی۔ لیکن شمیم نے اس احساس کو ختم کرنے کے لئے پھر گفتگو کرنی چاہی۔

"نازو اگر تمہیں یہاں کوئی کام نہ ہو تو آؤ باہر بیٹھیں۔" نازو نے خیر جواب دئے قدم آگے کو بڑھائے اور وہ دونوں آہستہ آہستہ نکل کر برآمدے میں آ گئے۔ امی باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی کھانا پکا رہی تھیں۔

"نازو میں ایک چیز تو دینا بھول ہی گیا۔" شمیم نے تیزی سے جیب میں ہاتھ ڈالا "لو یہ ہماری پارٹی کا ہفتہ وار اخبار ہے —— "قومی جنگ"

نازو کا ذہن پہلے ہی سے ایک عجیب قسم کی کشمکش میں مبتلا تھا۔

"یہ سفید کاغذ پر چھپا ہے؟" —— اس کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا وہ گھبرا گئی۔ نہ جانے شمیم کیا سوچے۔

"اور کیا رنگین کاغذ پر چھپتا۔ تمہارا مطلب اس رنگ سے ہے۔"

"نہیں، میں نے یونہی پوچھا تھا۔"

"نازو، یہ رنگ بذات خود ایک شہادت رکھتا ہے تمہیں معلوم ہے۔ اس رنگ سے ہماری مراد مزدوروں کی انقلابی تحریک ہے۔ یہی سب سے بڑی قومی جھنڈے کا رنگ ہے۔ تم نے جذبی کا وہ شعر سنا ——

وہ بلندی پہ ہے مزدوروں کا پرچم آج سرخ
اس کی جانب دیکھ جب تھکنے لگیں تیرے قوی

ہم اس رنگ کو دیکھ کر اپنے تھکے جسم میں دوبارہ قوت محسوس کرتے ہیں اور دشمن کی قوت سے لڑنے کی آزادی کے لئے کوشش کرتے ہیں" شمیم نے

باتوں میں جوش آتا جا رہا تھا، اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں بند ہو گئی تھیں۔ نازو نے یونہی پوچھا "آپ کو بڑی تکلیف ہوتی ہوگی، دن بھر دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے واقعی بڑی مصیبت کا کام ہے۔"

"نازو تم سمجھتی ہو میں یونہی بیکار مارا مارا پھرتا ہوں، کاش اپنے ملک کی ابتر حالت پر بھی نظر ڈالتیں ـــــ اپنے غلام ملک پر ـــــ ہمیں اس کی آزادی کی راہیں تلاش کرنی ہیں، ہم تلاش کرتے ہیں، کوشش کرتے ہیں اور اسوقت تک جبتک کہ ہم کو راستہ نہیں مل جاتا۔ چنانچہ ہندوستان کی آزادی، ہم اپنے قوت بازو سے حاصل کر سکتے ہیں لیکن متحد ہو کر ـــــ ہندو مسلم اتحاد اس کے لئے ناگزیر ہے۔ ہمیں چاہئے کہ متحد ہو کر اس کے لئے کوشش کریں۔ ہندو مسلم اتحاد ہمارے تمام قومی مسائل کو حل کر سکتا ہے یہ غذائی بحران جو آج ہر طرف دکھائی دے رہا ہے دور ہو سکتا ہے لیکن صرف قومی حکومت کے قوت بازو پر" شمیم بولتا جا رہا تھا اس کو اس کا مطلق احساس نہ تھا کہ نازو اس کی باتوں میں دلچسپی لے رہی ہے یا نہیں ـــــ نازو کی افسردگی اب غصہ کے حدود میں پہنچ چکی تھی۔ اس کے لئے یہ سیاست ایک مصیبت ہوگئی تھی ہر وقت یہ خشک باتیں ـــــ ہندوستان کی آزادی، ہندو مسلم اتحاد، قومی حکومت ـــــ ہر وقت اسی کا وظیفہ ہو گیا ہے۔ عجیب آدمی ہیں یہ بھی، کبھی یہ نہیں کہ ہنس بول کر باتیں کریں۔ آخر ہماری بھی طبیعت چاہتی ہے کہ اور طرح کی باتیں کریں۔ جب بھی آتے ہیں ایسی باتیں کرتے ہیں اور جب یہ ختم نہ ہونے والی باتیں ختم کرتے ہیں تو چل دیتے ہیں۔ میں صبح سے

شام تک انتظار کرتی ہوں —— میں بھی بیوقوف ہوں جو انتظار کروں لیکن نہیں اس کا وقت کس طرح کٹے گا، یہ پہاڑ سا دن کبھی ختم نہ ہوگا ——

اتنے میں امی باورچی خانے سے نکلیں، شاید وہ بھی شمیم ہی کی باتیں سن رہی تھیں۔

"بیٹا یہ سب کچھ تو ہوتا ہی رہیگا، ہندو مسلمان کبھی ٹھیک نہ ہونگے تو یہ تو بتا کہ کبھی نماز بھی پڑھتا ہے؟"

"نماز! —— چچی آپ نے نہیں سنا کہ کسی شاعر نے کہا ہے

ع غلام قوم کا سجدہ حرام ہوتا ہے

بس کیا فائدہ اپنی نمازوں کو حرام کرنے سے۔ جی نے ہیں نہیں ——"

"یہ کس مسئلہ میں ہے۔ اپنے لئے نئے مسائل تم لوگ نکالتے ہو، ان سکول کالجوں نے تو اور بھی خراب کر رکھا ہے۔"

"اچھا چچی اجازت دیجئے۔ کل شام کو پھر آؤں گا۔"

"کل شام کو آئیں گے! —— کہیں آئے نہ ہوں" ناز نے اپنے دل میں کہا۔ ہمیشہ یہی وعدہ کرتے ہیں، جاتے ہوئے کوئی خدمت کے

شمیم گھر سے باہر جا چکا تھا۔ ناز کا دماغ خراب ہو رہا تھا کہیں وہ پاگل نہ ہو جائے اس کی نظر کتاب پر پڑی "سرخ سویرا" پھر اس نے اخبار کو ہاتھ میں اٹھایا "قومی جنگ" اور "سرخ سویرا" دونوں چیزیں اسے بہت عزیز تھیں وہ اندر کمرہ میں چلی گئی وہاں اس نے چارپائی پر دونوں کو پٹک دیا۔ "سرخ سویرا" کہیں کا۔ کوئی کتاب میں کتاب ہے۔ وہ چارپائی پر گر پڑی اور گھنٹوں روئی ——

وہ شاید اسی طرح لیٹی رہتی اگر امی نہ آجاتیں۔

"نازو۔ ے میں تجھے ساری دنیا بھول گئی تھی۔ تیرے ابا لائے تھے" نازد نے اپنے آنسو پوچھے اور دوسری طرف غسل خانے میں چلی گئی۔ منہ دھوکر باہر آئی "کہاں ہے وہ ساری؟"

"یہ رکھی ہے" امی نے ایک سرخ ساری اس کے ہاتھ میں دیدی۔

"یہ ساری" وہ جھنجھلا گئی "میں تو نہیں پہنتی یہ بھی کوئی رنگ ہے لال خونی ___ مجھے نہیں چاہیئے" یہ کہہ کر اس نے اس کو چارپائی پر پٹک دیا۔ جہاں دیکھو یہی رنگ ہے جیسے ساری دنیا لال رنگ کی ہوجائے گی ___ شام ہو چکی تھی اس نے اوپر کی طرف جو نظر اٹھائی تو آسمان کی لالی سامنے آگئی، وہ تیزی سے کمرے میں گھس گئی ___ کاش وہ اپنی آنکھیں پھوڑ لیتی، یہ لال لال رنگ نہ نظر آتا۔ جدھر دیکھو یہی رنگ ہے ___ اس کا دماغ اُلجھنے لگا اس نے یہ بھی نہ سنا کہ امی کیا بڑبڑا رہی ہیں۔ اس نے زندگی میں شاید یہی پہلی بار امی کے غصہ کی پروا نہیں کی۔ لیکن امی کی بھی کیا غلطی انہیں کیا معلوم کہ نازو کو لال رنگ سے کتنی نفرت ہے۔ نازو نے بکس میں سے ایک سیاہ ساری نکالا اور پہن کر باہر آئی۔ اب وہ ہمیشہ اسی رنگ کے کپڑے پہنے گی۔ اسکی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ تاریکی بڑھتی جارہی تھی۔ نازو کی گھبراہٹ بھی اب کچھ کم ہو گئی تھی۔ سرخی اسکی نظروں سے اوجھل ہوتی جارہی تھی اور اس کی جگہ سیاہی نے لے لی تھی۔ وہ کچھ مطمئن سی ہو گئی تھی۔

عرصہ تک اس ماحول میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ شمیم کی سیاسی گرمجوشی
اپنی جگہ پر قائم تھی تو ناذد کی گھٹن، سیاست سے نفرت ایک خاموش بغاوت
کی حیثیت رکھتی تھی۔ جوں جوں حسرت کا عنصر بڑھتا جاتا تھا محبت میں بھی زیادتی
ہوتی جاتی تھی۔ لیکن ناذد کو یقین ہو چکا تھا کہ شمیم اس سے محبت نہیں کرتا۔ وہ یہاں
صرف اپنے سیاسی مقاصد کے لئے آتا ہے کیونکہ وہ اکثر کہا بھی کرتا تھا کہ ناذد ہم
کو اپنا پیغام زیادہ سے زیادہ آدمیوں میں پہنچانا ہے۔ اور ان کو اپنا ہم خیال بنانا
ہے۔ ناذد پھر سوچتی کہ کیا وہ اتنی خوبصورت نہیں کہ شمیم اس سے محبت کرے
یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اور سے محبت کرتا ہو۔ کوئی پری پیکر اس کے دل
پر حکومت کرتی ہو اور وہ اس کا دم بھرتا ہو لیکن نہیں شمیم کسی سے محبت نہیں کرتا
سیاست کی پتھریلی زمین میں محبت کا حسین اور نرم پودا کبھی سرسبز نہیں ہو سکتا
وہ تو محبت کی آگ کو سیاست سے بجھا دینا چاہتا ہے لیکن ناذد اس کو بجھنے
نہیں دے گی وہ آگ ہمیشہ اس کے سینے میں بھڑکتی رہے گی لیکن کیا مردوں
میں جذبات نہیں ہوتے کیا ان کی دنیا میں محبت ایک بے معنی لفظ ہے لیکن
نہیں شمیم کا کردار یقیناً اور مردوں سے مختلف ہے۔ ناذد جب بھی شمیم کو غور سے
دیکھتی تو اس کی آنکھوں میں اس کا دل تو کبھی نظر نہیں آتا بلکہ وہ ان آنکھوں
میں ایک دماغ دیکھتی ــــ وہ بیسویں صدی کا ایک نمائندہ۔ سیاست جس
کے دماغ نے اس کے دل پر قبضہ کر رکھا ہے لیکن کیا ناذد کے دل میں اتنی
قوت نہ تھی کہ وہ اس کے دماغ کو ہرا سکتی۔ یقیناً وہ کمزور ہے اس میں طاقت
نہیں ــــــ

دن اسی طرح سرعت سے گذرتے رہے حتیٰ کہ ایک دن نازو کی شادی بھی ہوگئی اور ایسے اجنبی سے جس کو وہ جانتی بھی نہ تھی۔ اس نے مخالفت تو کی لیکن مشرقیت کی حدود میں جس کا کوئی اثر نہ ہو سکا۔ وہ اس جدو جہد میں ہار گئی اور ایسا ہاری کہ تھک کر بیٹھ گئی۔

نازو کی شادی میں شمیم بھی مدعو تھا۔ لیکن اس نے سیاسی سرگرمیوں کی آڑ لے کر شادی میں شرکت نہ کی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اس روز وہ تمام دن پارٹی کے دفتر میں پڑا رہا۔ شام کو جب کامریڈ سرلش دفتر میں آئے تو انھوں نے بے تکلفی سے کہا "کیوں کامریڈ شمیم کیا معاملہ ہے۔ کیسی طبیعت ہے؟"

"کامریڈ یونہی سر میں درد ہے۔" اس نے گلوگیر آواز میں جواب دیا اور جب کامریڈ ستیش نے غور سے دیکھا تو وہ رو رہا تھا۔ اس کا تکیہ قریب قریب پورا تر ہو چکا تھا۔ صرف ایک ذرا سا حصہ باقی تھا جس پر سرخ گلاب کا پھول کڑھا ہوا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کو عمداً بھیگنے سے بچایا گیا ہے۔ کامریڈ ستیش نے بہت معلوم کرنا چاہا کہ کیا بات ہے مگر شمیم نے وہ راز کسی کو نہ بتایا، پارٹی آفیس میں ہر شخص محسوس کرتا تھا کہ اب شمیم میں وہ بات نہیں ـــــ وہ گرمجوشی نہیں جو پہلے تھی۔ وہاں سب سے زیادہ شور کرنے والا شمیم ایک خاموش تماشائی کی حیثیت رکھتا تھا۔ جب بھی کوئی سیاست کے کسی موضوع پر گفتگو کرتا تو اس کی طبیعت الجھتی ـــــ "ہر وقت سیاست ہی سیاست ـــــ کوئی بات بھی ہے۔ گاندھی جناح سمجھوتہ ہو ہی جائے گا۔ اس کے متعلق بیکار باتیں کرنے سے کیا فائدہ ـــــ"

نازو اپنی سسرال پہنچ چکی تھی اس کو ایک محبت کرنے والا شوہر ملا تھا آج وہ اپنا گھر سجا کر بیٹھی تھی۔ سامنے الماری میں وہ تمام "سرخ کتابیں" سجی ہوئی تھیں جو شمیم نے وقتاً فوقتاً لا کر دی تھیں۔ اس نے "سرخ سویرا" وہاں سے نکالا اور ورق گردانی کرنے لگی۔ اُس کی زندگی میں ایک انقلاب ہو چکا تھا آج اس کے کمرہ میں زیادہ چیزیں سرخ نظر آ رہی تھیں اور شاید یہی وجہ تھی کہ اس کے شوہر نے چند روز میں یہ محسوس کر لیا کہ اس کی بیوی فلسفہ کی ایک کتاب تھی۔

"سرخ سویرا کیسا ——" فرید کمرے میں داخل ہوا "یہ کیا نظموں کی کتاب پڑھ رہی ہو؟"

"فضول سی ہے —— آپ نے اس کو بغیر پڑھے ہی کس طرح فضول کہہ دیا "یہ مخدوم کی انقلاب آفریں نظموں کا مجموعہ ہے۔"

"یونہی —— میں نے اس کی ظاہری شکل دیکھ کر یہ رائے قائم کی تھی۔ خیر چھوڑو اس قصہ کو —— میں شادی کے موقع پر تم کو کوئی چیز نہ دے سکا۔ چلو ساریاں دیکھیں میں بہت سی لایا ہوں جو پسند کرو رکھ لو۔"

"ہاں آج کا اخبار نہیں لائے۔"

"یہ رکھا تو ہے"

"یہ تو میں نے منگوایا ہے۔ یہ ہفتہ وار قومی جنگ ہے۔"

"خیر تو پہلے ساری پسند کر لیجیے بعد میں دیکھ لیجیے گا۔"

نازو کمرے سے نکل کر صحن میں جو آئی تو [illegible]

تھا۔ تھی بہت سی مختلف رنگوں کی لیکن اس میں اس کا مرغوب رنگ کہاں
تھا، یکایک اس کی نظر سرخ رنگ والی ساری پر، پڑی۔ نازو نے اس کو
اُٹھا لیا اور کمرہ میں سے نکل گئی ـــــ فرید متحیر تھا ـــــ وہ کچھ نہ سمجھ سکا اگر یہی
حال رہا تو کہیں ایسا نہ ہو اس کا سارا گھر لال ہو جائے۔ اس نے گملے سے
ایک گلاب کا سرخ پھول توڑا اور مسل کر زمین پر پھینک دیا ـــــ